تاریخی مقالات

1112

محمد اسلم

فاضل جامعات
پنجاب، ڈرہم، مانچسٹر، کیمبرج
اُستاذ شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی

○

باہتمام
ناظم ندوۃ المصنفین سمن آباد، لاہور

58903

حقوق طباعت بحق مصنف محفوظ

طبع اوّل ـــــ مارچ ۱۹۷۰ء
ناشر ـــــ ناظم ندوۃ المصنفین، لاہور
طابع ـــــ محمد طفیل، مالک نقوش پریس، اردو بازار، لاہور
قیمت ـــــ سات روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ

۱۔ ندوۃ المصنفین، ۹۵۰ این، سمن آباد، لاہور

۲۔ آئینۂ ادب، چوک مینار، انار کلی، لاہور

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
کیا سلطان بلبن کی کوئی بیٹی حضرت بابا فریدالدین گنجشکرؒ سے منسوب تھی	9
فضل اللہ بن روزبہان اصفہانی اور ان کا ایک نادر رسالہ	۳۲
مبلغ الرجال	۶۱
پیر محمد شاہ اور ان کا نادر کتب خانہ	۸۳
شاہانِ مغلیہ کا ذوقِ موسیقی	۹۴
مسلمانوں کی جغرافیائی خدمات	۱۵۰
خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ	۱۶۲
فتوحات فیروز شاہی	۱۸۰
اسلامی ہندوستان میں سکوں پہ شاعری	۲۰۳
اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی میں علماء و مشائخ کا کردار	۲۲۶
مسجد قباء سے تاج محل تک	۲۴۳
مسلمانوں کی طبی خدمات	۲۵۰
داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد	۲۷۸

عرضِ مصنف

گذشتہ کئی برسوں سے برصغیر پاک و ہند کے علمی و ادبی رسائل میں میرے تحقیقی اور ادبی مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ میرے علم دوست احباب میں سے جناب محمد عبداللہ قریشی اور جناب حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے مجھے بارہا یہ مشورہ دیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو ان مقالات کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ میری اپنی بھی خواہش تھی کہ ان متفرق مضامین کو نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں محفوظ کر لوں لیکن علم کی ناقدری اور علمی کتابوں کی کساد بازاری کے اس دور میں کسی ناشر کو ان مقالات کی اشاعت کے لئے رضامند کرنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ جب سے علمی، ادبی اور دینی کتابوں کی اشاعت کے لئے ہم نے لاہور میں محض توکلاً علی اللہ ندوۃ المصنفین قائم کیا ہے، ٹھوس علمی کتابوں کی اشاعت ممکن ہی نہیں بلکہ آسان ہو گئی ہے۔ اس ادارے کی پہلی کتاب۔ دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر تھی۔ پانچ ہفتوں کے وقفہ کے بعد دوسری کتاب حاضر ہے۔ اس کتاب میں جو مقالات شامل ہیں ان کو پڑھنے کے بعد ہی ان کی افادیت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہو گا۔

اس کتاب کی طباعت کے دوران جناب شیخ ضیاء الاسلام صاحب اور جناب محمد عبداللہ قریشی نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی ہے۔ میں ان دونوں بزرگوں کا صمیم قلب سے ممنون ہوں۔ میں جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب، سابق صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کا خاص طور پر سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی علالت اور مصروفیت کے باوجود میرے مقالات کا مطالعہ کیا اور اس کتاب کے لئے ایک عالمانہ تقریظ تحریر فرمائی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ندوۃ المصنفین، لاہور

احقر العباد: محمد اسلم

انتساب

میں اپنی اس تالیف کو
تاریخ کے شہرۂ آفاق اُستاد
پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب
کے نام
محبت اور عقیدت کے جذبات کے ساتھ
معنون کرتا ہوں

پیش لفظ

شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے جواں سال استاذ اور تاریخ کے ہونہار طالب علم مسٹر محمد اسلم پاکستان، بھارت اور بیرونی ممالک کے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ جامعات پنجاب، ڈرہم، مانچسٹر اور کیمبرج کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان کی اوّلین تصنیف۔ دینِ الٰہی کے موضوع پر دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ حال ہی میں اس کتاب کا جدید ایڈیشن طویل اضافوں کے ساتھ لاہور سے ندوۃ المصنفین کی اوّلین پیشکش کے طور پر۔ دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر۔ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ دینِ الٰہی ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے اور اس کے متعلق عوام میں خاصی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ دینِ الٰہی کے موضوع پر مسٹر محمد اسلم کی کتاب سے زیادہ مستند کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فاضل مصنف نے اس کی تالیف کے دوران ایسے بہت سے مخطوطات سے استفادہ کیا ہے جو اب تک مستشرقینِ یورپ اور خود ہمارے تاریخ دانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ فاضل مصنف کے بعض نظریات سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک مآخذ سے استنباط کا تعلق ہے وہ شک و شبہ سے بالا ہے۔ مصنف نے جس محنت، تجسس اور ذوق و شوق کے ساتھ اس کتاب کے لئے مواد اکٹھا کیا ہے اور

پھر اسے جس قرینے کے ساتھ ترتیب دیا ہے وہ اسی کا حصّہ ہے۔

مسٹر اسلم کی تازہ تصنیف **تاریخی مقالات** حال ہی میں قائم ہونے والے ادارے ندوۃ المصنفین کی دوسری پیشکش ہے۔ زیبِ عنوان کتاب عزیز موصوف کے ان مقالات پر مشتمل ہے جو پاکستان اور بھارت کے بلند پایہ علمی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالات، جن کا بظاہر ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں، اپنے اندر وسیع معلومات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے جہاں مصنف کے تبحرِ علمی اور وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے وہیں اس صبر آزما محنت اور لگن کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کے ساتھ عزیز گرامی نے ہمارے گمشدہ علمی اور ثقافتی ورثے کا کھوج لگا کر اپنے قارئین کو نامور مسلم فضلاء اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا ہے۔

مسٹر اسلم تاریخ کے متبحر عالم ہیں اور انہوں نے تاریخ کے مطالعہ کے بعد خود کو مسلمانوں کی اعلیٰ علمی روایات اور تاریخ نگاری کے حقیقی معیار تک پہنچا دیا ہے۔ وہ اپنے نتائجِ فکر کو نہ تو دوسروں پر ٹھونسنے کے عادی ہیں اور نہ ہی وہ اپنے قاری کو اپنا ہم خیال بنانے کی خواہ مخواہ کوشش کرتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نئے حقائق تلاش کریں اور منصفانہ طریقے سے ہماری علمی و ادبی تاریخ کے تاریک گوشوں کو اجاگر کرتے چلے جائیں۔ وہ اس بات کا فیصلہ اپنے قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ خود ان کی ذوق و تجسس کے ساتھ جمع کردہ معلومات اور متوازن تحریروں کی روشنی میں کسی شخص کا علمی مقام متعین کریں۔ اُنھوں نے یہ مقالات بڑے علمی ذوق اور خلوصِ نیت کے ساتھ لکھے ہیں، اس پر طرہ یہ کہ ان کی تحریروں میں شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔

ان مقالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک قاری دوگونہ اثر لیتا ہے

جہاں ایک طرف وہ ان بلند پایہ علمی مقالات سے شاد کام ہوتا ہے وہیں اُسے یہ حسرت رہ جاتی ہے کہ ان موضوعات پہ اور زیادہ کیوں نہیں لکھا گیا، حالانکہ یہ موضوع ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پہ ایک جامع کتاب لکھی جا سکتی ہے اس لحاظ سے ان مقالات کے مطالعہ کے بعد جہاں ایک قاری ایک کیف سا محسوس کرتا ہے وہیں وہ تشنگی بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کتاب کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے بلکہ یہاں یہ بات مدنظر رکھنی چاہیئے کہ جن رسائل میں یہ مقالات شائع ہوئے ہیں ان میں ہر مضمون کے لئے بنی تلی ہوئی جگہ ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے مقالات میں مصنف کے لئے زیادہ تفصیل میں جانے یا اپنی قابلیت کے جوہر دکھلانے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

یہ کتاب جو تیرہ مقالات پر مشتمل ہے، تاریخ، موسیقی، فنِ تعبیر، طب، شاعری، سوانح اور جغرافیہ جیسے موضوعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اس اعتبار سے اس کتاب میں ہر شخص کے ذوق کا سامان موجود ہے۔ اس کتاب کا ہر مقالہ اپنی جگہ پر منفرد ہے اور ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فاضل مصنف ہر موضوع پہ عالمانہ انداز میں لکھ سکتا ہے۔ اس کتاب میں چند مقالات ایسے بھی آئے ہیں جہاں مصنف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کی گنجائش ہے، تاہم اس کتاب کا مطالعہ تاریخ کے اساتذہ اور طلباء کے لئے سود مند ہونے کے علاوہ ان میں تحقیق کا ذوق پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوگا۔ آخر میں میں فاضل مصنف کو اس کتاب کی اشاعت پہ خلوصِ دل سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

سمن آباد
لاہور

شیخ عبدالرشید

کیا سُلطان بلبن کی کوئی بیٹی حضرت بابا فرید الدین گنجشکرؒ سے منسوب تھی؟

سُلطان غیاث الدین بلبن کی بیٹی کے ساتھ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے عقد کا واقعہ زبان زدِ خلائق ہے۔ اس موضوع پر راقم السطور نے جو تحقیق کی ہے وہ ہدیۂ قارئین ہے، اس سوال کے جواب کے لئے سب سے پہلے ہم حضرت بابا صاحبؒ کے محرمِ راز، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

فوائد الفواد، حضرت سلطان المشائخؒ کے ملفوظات کا ایک بیش قیمت مجموعہ ہے جسے ان کے فاضل مُرید خواجہ حسن سجزیؒ نے مرتب کیا تھا، اس کتاب کی تاریخی حیثیت ہمیشہ شک و شبہ سے بالا تر رہی ہے۔ چشتیہ نظامیہ سلسلہ سے وابستہ فقراء کے نزدیک اس کا وہی مقام ہے جو سہروردیہ سلسلہ کے درویشوں کے ہاں حضرت ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی عوارف المعارف کا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے زیادہ بابا صاحبؒ کا کوئی دوسرا محرمِ راز نہ تھا تاہم اس ۴۶۳ صفحات کی ضخیم کتاب میں جہاں بابا صاحبؒ کے بے شمار فضائل بیان کئے گئے ہیں وہاں سلطان غیاث الدین بلبن کی بیٹی کے ساتھ ان کے

رشتہ کا اصلاً کوئی ذکر موجود نہیں، اگر ایسا ازدواجی رشتہ موجود ہوتا تو حضرت نظام الدین اولیاؒ اس کا کبھی نہ کبھی تو ضرور ہی ذکر فرماتے۔[1]

امیر حسن سجزیؒ کی طرح سید محمد مبارک امیر خورد کرمانیؒ بھی حضرت سلطان المشائخؒ کے دامن ارادت سے وابستہ تھے اور انھوں نے سیر الاولیاء کے نام سے خواجگانِ چشت کے سوانح پر ۵۶۴ صفحات کی ایک ضخیم کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے، اس کتاب میں باباصاحبؒ کے حالات ۵۷ صفحہ سے ۹۱ صفحہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔[2] باباصاحبؒ کے سوانح حیات پر سید امیر خوردؒ نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کی زندگی کا کوئی پہلو فاضل مصنف کی نگاہ باریک بیں سے اوجھل نہیں رہا۔ اس کتاب کے اندراجات کے متعلق پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب رقمطراز ہیں:۔

"اس کتاب میں بابا فریدؒ کی زندگی کے واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور ان کے علاوہ ان کے خاندان اور خلفاء کے حالات بھی اس کتاب میں مندرج ہیں، امیر خوردؒ کی معلومات اپنے گھرانے کی یادداشت پر مبنی ہیں یا پھر خواجہ نظام الدینؒ کے ارادت مندوں سے حاصل کی گئی ہیں جنھوں نے اس سرمایہ کو محفوظ کر لیا تھا۔"[3]

اس کے باوجود اس کتاب میں باباصاحبؒ اور سلطان بلبن کی بیٹی کے رشتہ کا مطلق کوئی ذکر موجود نہیں۔ حالانکہ امیر خوردؒ نے ان کے بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں اور نواسوں تک کے حالات بالتفصیل لکھے ہیں۔

---

[1] امیر حسن سجزی، فوائد الفواد، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء [2] امیر خورد، سیر الاولیاء مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ

[3] پروفیسر شیخ عبدالرشید ہسٹوریز آف انڈیا، پاکستان اینڈ سیلون مطبوعہ لندن ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۵

سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ملفوظات ان کے ایک مرید حمید قلندر نے خیر المجالس کے نام سے مُرتب کئے تھے جنھیں استادِ گرامی جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بڑے خوبصورت ٹائپ میں علی گڑھ سے شائع کیا ہے۔[کہ] ۳۰۷ صفحات کی اس عظیم کتاب میں بھی اس واقعہ کا سرے سے کوئی ذکر ہی موجود نہیں ہے، اگر حضرت نصیر الدینؒ نے ایسی کوئی بات حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زبانِ حقیقت بیان سے کبھی سنی ہوتی تو وہ اس کا کبھی نہ کبھی تو اپنی مجلس میں ذکر فرماتے۔

عہدِ سلطنت کے سب سے نامور مؤرخ ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان بلبن کے حالات ۱۱۶ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں لیکن اس کتاب میں بھی سلطان بلبن کی بیٹی کے ساتھ باباصاحبؒ کی نسبت کا کوئی ذکر موجود نہیں[شہ] اس پر لطف یہ ہے کہ ضیاء الدین برنی حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ تھا اور اگر اس نے کبھی حضرت محبوبِ الٰہی کی زبانِ فیض ترجمان سے ایسی بات سنی ہوتی یا کسی اور ذریعہ سے اُسے اس رشتہ کا علم ہوتا تو وہ بڑے فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتا۔ اس کی تاریخ فیروز شاہی باباصاحبؒ اور سلطان بلبن کی لاتعلقی پر ایک خاموش گواہ کی حیثیت سے موجود ہے۔

عہدِ فیروزی کے مشہور مؤرخ شمس سراج عفیف نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف تاریخ فیروز شاہی میں مشائخ چشت کا جابجا ذکر کیا ہے، فاضل مصنف باباصاحبؒ

[کہ] حمید قلندر، خیر المجالس، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۵۹ء

[شہ] ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، جلد اوّل، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۲۹- ۱۴۶

کے خلیفۂ اوّل حضرت قطب جمال ہانسویؒ کے جلیل القدر پوتے حضرت قطب الدین منورؒ کا مرید تھا۔ اس نے اپنے مشائخ کے فضائل و مناقب بڑے عمدہ پیرایہ میں بیان کئے ہیں لیکن اس کی ۵۱۶ صفحات کی تاریخ فیروز شاہی بابا صاحبؒ اور سلطان بلبن کی بیٹی کی لاتعلقی پر بہترین گواہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش ہے۔[1]

یحییٰ سہرندی، سلاطین سادات کے عہد کا ایک نامور مورخ ہے اور اس کی تاریخ مبارکشاہی علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں سلطان بلبن کا ذکر ۳۹ صفحہ سے ۵۲ صفحہ تک کیا ہے لیکن وہ بھی بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کے رشتے سے بے خبر تھا[2]

شیخ جمالی، سلطان سکندر لودھی کے اُستاد اور اکبر کے سب سے پہلے صدر الصدور شیخ گدائی کے والد، اپنے زمانے میں بڑے نامور صوفی اور شاعر ہو گزرے ہیں۔ مولانا جامیؒ کے ساتھ ان کے تعلقات کے سلسلہ میں کئی دلچسپ لطائف قارئین میں سے اکثر و بیشتر نے سنے ہوں گے۔ شیخ جمالی نے خواجگان چشت کے حالات سیر العارفین میں بڑی محنت سے، اور اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو سب سے پہلے، سائنٹفک طریقہ پر قلمبند کئے ہیں۔ اس کتاب میں بابا صاحبؒ کا ذکر خیر کرتے ہوئے شیخ جمالی رقمطراز ہیں کہ سلطان ناصرالدین محمود کے عہد میں بلبن، جو ان دنوں اُلغ خان کے لقب سے ملقب اور سلطان کا وزیر تھا، چار گاؤں کی جاگیر کا قبالہ لیکر بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؒ نے یہ فرماتے ہوئے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

---

[1] شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء

[2] یحییٰ سہرندی، تاریخ مبارک شاہی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۳۹ – ۵۲

ہر کرا طالب و راغب دانید	جو اس سے رغبت رکھتا ہو یا اس کا
برسانید"	طالب ہو اُسے پہنچا دو۔

اس موقعہ پر بھی شیخ جمالی نے کسی ازدواجی رشتہ کا ذکر نہیں فرمایا حالانکہ یہ اس کے بیان کا بہترین موقعہ تھا۔[۸]

بابر و ہمایوں کے عہد میں چشتیہ سلسلہ میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بڑے نامور بزرگ ہو گذرے ہیں۔ اور جن مشائخ نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے تحریک چلائی تھی، آپ ان کے علمبردار تھے۔ آپ کے ملفوظات آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدینؒ نے مرتب کئے تھے، ان میں بھی حضرت بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کے رشتہ کا کہیں ذکر نہیں آیا۔[۹]

ملا نظام الدین احمد، صاحبِ طبقات اکبری و مرتب تاریخ الفی اکبر کے عہد میں نامور مؤرخ ہو گذرا ہے۔ اس نے طبقات اکبری میں سلطان غیاث الدین بلبن کا ذکر صفحہ ۸۰ سے صفحہ ۱۰۳ تک کیا ہے۔ بلبن کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے ملا صاحب رقمطراز ہیں[۱۰]:-

"بصیام نفل و قیام شب و مواظبت	سلطان بلبن نفلی روزے رکھنے کے
جمع و جماعات و نماز اشراق و تہجد	علاوہ رات کو قیام کرتا اور پابندی کے
اشتغال داشت و اصلاے وضو	ساتھ نماز جمعہ میں شریک ہوتا تھا۔
نبودے و بے حضور علماء و صلحاء دست	وہ نماز با جماعت کا بڑا خیال رکھتا تھا اور

---

[۸] شیخ جمالی، سیر العارفین، قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر P II ۵، ورق، ۳ الف تا ۵۴ ب،

[۹] لطائف قدوسی، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ، تعداد صفحات ۱۰۷

[۱۰] نظام الدین احمد، طبقات اکبری، جلد اوّل، کلکتہ ۱۹۲۷ء ص ۸۲

بطعام نبردے، در وقت طعام خوردن مسائل شرعی از علمائے تحقیق نمودے و در خانہای بزرگان رفتے و بعد از نماز جمعہ زیارت مقابر کردے و در جنازۂ اکابر حاضر شدے و بتعزیت رفتے و پسران و خویشان میت را بخلعت نوازش فرمودے و وظیفہ میّت بر وارثانِ او مقرر داشتے و باچندین حشمت و دبدبہ اگر در عین سواری خبر یافتے کہ فلان جا مجلس وعظ است در ساعت فرود آمدے وتذکیر شنیدے و گریہ کردے۔"

اشراق و تہجد کبھی فوت نہ ہونے دیتا۔ سلطان ہمیشہ باوضو رہتا اور جب تک علماؑ و صلحاؑ موجود نہ ہوتے وہ کھانے کو ہاتھ نہ لگاتا۔ کھانے کے دوران بھی وہ علما سے شرعی مسائل دریافت کیا کرتا تھا۔ سلطان بزرگانِ دین کے گھروں میں بھی چلا جاتا اور نماز جمعہ کے بعد وہ مقابر کی زیارت کو نکل جاتا تھا۔ وہ بزرگوں کے جنازوں میں شریک ہوتا اور ان کی تعزیت کے لئے بھی جایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میّت کے بیٹوں اور رشتہ داروں کو کپڑے دیتا اور مرنے والے کا وظیفہ اس کے وارثوں کے نام منتقل کر دیتا تھا۔ اس قدر جاہ و جلال کے باوجود اگر وہ کبھی سوار ہو کر نکلتا اور اسے خبر ملتی کہ فلاں جگہ وعظ ہو رہا ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے سواری سے اتر آتا، وعظ سنتا اور رونے لگتا۔

نظام الدین احمد نے اس کے اوصافِ حمیدہ کے ضمن میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس نے اپنی دختر نیک اختر ایک درویش کے عقد میں دے دی تھی۔

اسی عہد کے دوسرے نامور اور شہرۂ آفاق مورخ ملّا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ کی تینوں جلدیں میرے پیشِ نظر ہیں۔ جلد اوّل میں سلطان غیاث الدین بلبن کا ذکر ۱۲۷ صفحہ سے ۱۵۷ صفحہ تک پھیلا ہوا ہے[11]۔ ملّا صاحب نے

---

[11] منتخب التواریخ، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء، ص ۱۲۷ - ۱۵۷۔

بھی سنی العقیدہ اور معتقد فقرا ہونے کے باوجود بابا صاحبؒ کے ساتھ اس کی بیٹی کے رشتہ کا مطلق ذکر نہیں فرمایا۔ حالانکہ ملا صاحب بال کی کھال اتارنے اور رائی کا پہاڑ بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اس کے باوجود انھوں نے اس بات کا ذکر اشارۃً بھی نہیں فرمایا۔

ابوالقاسم ہندو شاہ فرشتہ بھی اکبر کا ہم عصر مورخ تھا، اس کی تاریخ گلزارِ ابراہیمی سے، جو عوام میں "تاریخ فرشتہ" کے نام سے مشہور ہے، تاریخ کا ہر طالبِ علم واقف ہے، گلزارِ ابراہیمی میں فرشتہ نے ہندوستان کے اولیائے عظام کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور بابا صاحبؒ کے سوانح حیات فل سکیپ سائز کے ۱۴ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں[۱۲]۔ بابا صاحبؒ کے متعلق فرشتہ کی معلومات ہم میں سے اکثر و بیشتر اشخاص سے کہیں زیادہ ہیں، لیکن اس کے باوجود سلطان بلبن کی بیٹی کے ساتھ بابا صاحبؒ کے رشتہ سے وہ بھی بے خبر تھا۔

ابوالفضل علامی مغل شہنشاہ اکبر کا وزیرِ اعلیٰ اور اپنے زمانے کا بہترین اہلِ قلم تھا، اس کی تصانیف میں سے انشائے ابوالفضل، آئینِ اکبری اور اکبر نامہ اس کی علمیت پر دال ہیں۔

اکبر نامہ ابوالفضل کی بڑی اہم تصنیف ہے جو تین جلدوں میں طبع ہو چکی ہے، ہر چند کہ یہ کتاب عہدِ اکبر کے واقعات پر مشتمل ہے تاہم اس میں بزرگانِ دین کا ذکرِ خیر بھی ضمناً آ گیا ہے، اکبر نامہ جلد دوم میں بابا صاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود ہے لیکن بنتِ بلبن سے ان کی نسبت کا ذکر موجود نہیں[۱۳]۔

---

[۱۲] فرشتہ، گلزارِ ابراہیمی، جلد دوم مطبوعہ ۱۸۳۲ء، ص ۷۱۵ - ۷۲۹

[۱۳] ابوالفضل، اکبر نامہ، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء، ص ۳۵۹،

آئین اکبری اس کی دوسری اہم کتاب ہے اس کی تیسری جلد کا انگریزی ترجمہ کرنل ایچ، ایس، جیرٹ نے کلکتہ سے ۱۸۹۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں اولیائے ہند“ کے عنوان سے ابوالفضل نے جن بزرگانِ دین کے سوانح حیات پر قلم اٹھایا ہے ان میں باباصاحب کا نامِ نامی بھی موجود ہے[14] لیکن سلطان بلبن کی بیٹی کے ساتھ ان کے رشتہ سے ابوالفضل بھی بے خبر ہے۔ اگر ابوالفضل اکبرنامہ میں یہ بات لکھنی بھول گیا تھا تو آئینِ اکبری میں ہی اس کا ذکر آجانا چاہیئے تھا۔

عبدالباقی نہاوندی، عبدالرحیم خانخاناں کے دسترخوان کرم کا ریزہ چین تھا۔ اس نے اپنے محسن، اس کے آباؤ اجداد، ہم عصر علماء، شعراء اور فضلاء کا ذکر بڑے عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔ اس کی مایہ ناز تصنیف مآثرِ رحیمی ۱۹۲۴ء میں کلکتہ سے چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ہندوستان کے قدیم سلاطین کا ذکر بھی موجود ہے اور اس ضمن میں اس نے سلطان بلبن کے سوانح حیات بھی قلمبند کئے ہیں لیکن وہ بھی ایسے رشتہ سے بے خبر تھا۔[15]

بزرگوں کے سوانح حیات پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اخبارالاخیار اس پایہ کی کتاب ہے کہ جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں اس کتاب کی تصنیف پر شیخ محدثؒ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔[16] اس کتاب کے بارے میں اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ شیخ محدثؒ کے بعد آنے والے تمام تذکرہ نویسوں نے اس سے

---

[14] ابوالفضل، آئین اکبری، جلد سوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۴ء، ص ۳۶۳ - ۳۶۴،

[15] عبدالباقی نہاوندی، مآثر رحیمی، جلد اول، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۴ء، ص ۳۰۵ - ۳۰۶

[16] تزک جہانگیری، (سرسید ایڈیشن) علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۸۲ -

استفادہ کیا ہے۔ اخبار الاخیار میں بابا صاحبؒ کا ذکر خیر بھی موجود ہے لیکن بلبن کی بیٹی کے ساتھ ان کی نسبت پر شیخ موصوف بھی خاموش ہیں[۱۷]

محمد غوثی مندوی صاحب گلزار ابرار عہد اکبر و جہانگیر میں مشہور تذکرہ نویس ہو گذرے ہیں۔ گلزار ابرار کا اُردو ترجمہ تو مدّت ہوئی اذکار ابرار کے نام سے شائع ہو چکا ہے، لیکن اصل کتاب ہنوز زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس کا ایک بڑا عمدہ قلمی نسخہ جان رے لینڈ لائبریری مانچسٹر میں محفوظ ہے جس کی مائیکرو فلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ محمد غوثی نے آٹھ صفحات پہ بابا صاحبؒ اور ان کی اولاد اور خلفاء کے حالات درج کیے ہیں اور انہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بنت بلبن اور بابا صاحبؒ کے رشتہ سے بے خبر تھا۔[۱۸]

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے اور جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے ایک مرید علی اکبر حسینی اردستانی نے مجمع الاولیاء کے نام سے تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات کی ایک عظیم اور ضخیم کتاب شاہجہان کی تخت نشینی کے چھ سال بعد قلمبند کی تھی۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے جس کی مائیکرو فلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ اس کتاب میں بابا صاحبؒ کے سوانح حیات بھی ملتے ہیں لیکن اس رشتہ کا ذکر کہیں موجود نہیں[۱۹] حالانکہ مجمع الاولیاء ایک ایسی کتاب ہے کہ اس میں بعض ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جو صرف سننے میں

---

[۱۷] شیخ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۵۲ - ۵۴

[۱۸] گلزار ابرار، فارسی مخطوطہ نمبر ۱۰۵، جان رے لینڈ لائبریری مانچسٹر، ورق ۲۶ الف تا ۲۹ ب،

[۱۹] مجمع الاولیاء - انڈیا آفس لائبریری، مخطوطہ نمبر ایتھے ۶۴۵، ورق ۶۵۱ الف تا ۶۵۲ ب' (مجمع الاولیاء کا ایک مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی محفوظ ہے)

آتے ہیں لیکن پڑھنے میں نہیں آتے ۔

مجمع الاولیاء کی تصنیف کے چھ سال بعد ۱۰۴۹ھ میں شہزادہ دارا شکوہ نے بزرگانِ دین کے سوانح حیات پر سفینۃ الاولیاء کے نام سے ایک کتاب مرتب کی، اس میں بھی بابا صاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود ہے[۲۰]۔ اگر سلطان بلبن کی کوئی بیٹی بابا صاحبؒ کے حرم میں ہوتی تو شہزادہ دارا شکوہ اس کا ذکر بڑے فخریہ پیرائے میں کرتا۔ یہ بڑے اچنبے کی بات ہے کہ دارا شکوہ نے بابا صاحبؒ اور ان کی رفیقۂ حیات کا مکالمہ نقل کیا ہے جس میں وہ نیک بخت بابا صاحبؒ سے تنگ دستی اور فاقہ مستی کا گلہ کرتی ہے، کم از کم ایسے موقع پر تو دارا شکوہ یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ وہ سلطان بلبن کی بیٹی تھی اور اس نے اچھا وقت دیکھا ہوا تھا اور جب فاقوں تک نوبت پہنچی تو بابا صاحبؒ سے شکوہ کرنے لگی ۔

دارا شکوہ کی بہن شہزادی جہاں آرا نے اپنے طور پر خواجگانِ چشت کے سوانح حیات مونس الارواح کے نام سے مرتب کئے تھے، اس کتاب میں بابا صاحب کا ذکرِ خیر آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے[۲۱]۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جہاں آرا بھی خواجگانِ چشت سے عقیدت کے باوجود بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کے رشتہ سے بے خبر تھی۔

عہدِ عالمگیر کے مشہور مؤرخ بختاور خاں کی ریاض الاولیاء بھی اسی سلسلے کی ایک اہم اور ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب بھی بدقسمتی سے ہنوز طبع نہیں

---

[۲۰] دارا شکوہ، سفینۃ الاولیاء، مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۲ء، ص ۹۶ - ۹۷،

[۲۱] جہاں آرا، مونس الارواح، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی نمبر ۱۱۹/۴ III PF، ورق ۹۰ ب تا ۹۴ الف

ہوئی لیکن اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے، جس کی مائیکرو فلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ اس میں باباصاحبؒ کے سوانح حیات بھی مندرج ہیں لیکن بنتِ بلبن کے ساتھ ان کے رشتۂ ازدواج کا ذکر موجود نہیں[۲۲]

اسی سلسلے کی ایک کتاب سفینۃ العارفین۔ مرتبہ محمد امان کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے جس کی مائیکرو فلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے اس میں باباصاحبؒ کا ذکر خیر موجود ہے لیکن محمد امان بھی بنتِ بلبن کے ساتھ ان کے تعلق سے بے خبر ہے۔[۲۳]

بہرحال سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے تک ساڑھے چار سو سال میں جن مطبوعہ کتب تاریخ یا صوفیانہ تذکروں میں جہاں کہیں سلطان بلبن یا باباصاحبؒ کا ذکر خیر آیا ہے۔ وہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ان کتابوں میں باباصاحبؒ اور سلطان بلبن کی بیٹی کی نسبت کا کسی نے کھل کر لو کیا اشارۃً یا کنایۃً بھی ذکر نہیں کیا۔ اگر اس مفروضہ میں ذرہ بھر بھی حقیقت ہوتی تو کوئی نہ کوئی تذکرہ نویس اس کا ذکر ضرور کرتا۔ آخر اتنا اہم اور بڑا واقعہ تاریخ نگاروں یا تذکرہ نویسوں کی نظروں سے کیونکر اوجھل رہ سکتا تھا۔

انگریزی عہد میں جب پہلی بار ۱۸۴۲ء میں گزیٹیر آف منٹگمری ڈسٹرکٹ شائع ہوا تو اس میں بھی باباصاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود تھا۔ لیکن اس میں بھی باباصاحبؒ کے سوانح حیات کے ضمن میں فاضل مرتب نے بنتِ بلبن کے ساتھ ان کی

---

[۲۲] ریاض الاولیاء، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن نمبر اورینٹل ۱۷۴۵، ورق ۲۴ اب تا ۱۵۳ اب،

[۲۳] سفینۃ العارفین قلمی نسخہ، برٹش میوزیم لندن نمبر اورینٹل ۲۱۳، ورق ۲۲ الف، ۲۲ ب

نسبت کا کوئی ذکر نہیں کیا[24]۔

زمانہ حال کے مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام صاحب کا بڑا اونچا مقام ہے۔ آپ نے "آب کوثر" میں بارہ صفحات میں بابا صاحبؒ کے سوانح حیات قلمبند کئے ہیں۔ سلطان بلبن اور بابا صاحبؒ کے تعلقات کے ضمن میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ سلطان بلبن اپنے زمانۂ وزارت میں بابا صاحبؒ کی خدمت میں چار گاؤں کی ایک جاگیر کا پروانہ لے کر حاضر ہوا لیکن بابا صاحبؒ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ بلبن کی بیٹی کے ساتھ بابا صاحبؒ کی نسبت کا ذکر کرنے کا یہ بہترین موقع تھا لیکن شیخ صاحب بھی اس نسبت کے متعلق خاموش ہیں[25]۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں آرٹیکل "فریدالدین مسعود گنج شکر" موجود ہے اور فاضل مصنف نے ببلیوگرافی میں بے شمار ایسی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے نام گنوائے ہیں جن میں بابا صاحبؒ کا ذکر خیر موجود ہے، لیکن اُسے بھی ایسی کوئی شہادت نہ مل سکی جس سے یہ ثابت ہوتا کہ بابا صاحبؒ کے نکاح میں سلطان بلبن کی کوئی بیٹی بھی تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی ہمارے زمانے میں عہدِ سلطنت کی تاریخ و ثقافت اور چشتیہ خاندان کے بزرگوں پر آخری سند سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب "دی لائف اینڈ ٹائمز آف حضرت فریدالدین گنجشکر" علی گڑھ سے شائع ہو چکی ہے۔ مشہور مستشرق اور ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہملٹن گب نے

---

[24] گزٹیر آف دی منٹگمری ڈسٹرکٹ، مطبوعہ لاہور ۱۸۸۳ء، ص ۱۸۴ - ۱۸۵،

[25] آب کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۲۴۶ - ۲۵۸

کبھی کسی کتاب پر تقریظ نہیں لکھی، لیکن اس کتاب میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تحقیق و کاوش ملاحظہ کرتے ہوئے انھوں نے پہلی بار اپنا اصول توڑا۔ قارئین کو شاید یہ جان کر مایوسی ہوگی کہ اس کتاب میں بھی کسی ایسی نسبت کا ذکر موجود نہیں[26]

"سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" پروفیسر خلیق احمد نظامی کی ایک اور مایۂ ناز تصنیف ہے اور حق تو یہ ہے کہ آج تک اس موضوع پر ایسی پُر مغز کتاب کسی اسکالر کے قلم سے نہیں نکلی۔ اس میں سلطان بلبن کے مذہبی رجحانات کے ضمن میں آپ تحریر فرماتے ہیں:-

"جواہر فریدی میں گلشن اولیاء کے حوالے سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ بلبن کی ایک بیٹی کی شادی بابا صاحب سے ہوئی تھی اور بعد کے تذکروں میں اس سلسلہ میں بہت سے قصے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن کئی وجوہ کی بنا پر ہم اس روایت کو صحیح تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ اول تو یہ کہ کسی معاصر مؤرخ یا تذکرہ نویس نے اس کا ذکر نہیں کیا، برنی کی تاریخ اور میر خورد کے تذکرہ میں متعدد مقامات ایسے آئے ہیں جہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ روایت کسی حقیقت پر مبنی ہوتی تو وہ اس کا ضرور ذکر کرتے۔ علاوہ ازیں بابا صاحبؒ کا سلاطین اور امراء کی طرف جو رویہ تھا اس کے پیش نظر اس قسم کے رشتہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"[27]

یہ بڑے اچنبے کی بات ہے کہ وہ واقعات جن کا ذکر بلبن کے عہد سے

---

[26] خلیق احمد نظامی، دی لائف اینڈ ٹائمز آف حضرت فریدالدین گنج شکر، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۵ء

[27] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۶۷

سے کر اورنگ زیب کے عہد تک کسی مؤرخ یا تذکرہ نویس نے نہیں کیا اُن کا ذکر گذشتہ صدی کے آواخر میں شائع ہونے والی کتابوں مثلاً خزینۃ الاصفیا، حقیقتِ گلزارِ صابری، جواہرِ فریدی اور چراغ الچشت میں موجود ہے، مؤخر الذکر تینوں کتابوں میں اکثر و بیشتر ایسے بے سر و پا قصے پڑھنے میں آتے ہیں کہ ان کا ذکر کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ ان کتابوں کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ فنِ تذکرہ نویسی کے معیار پر پورا اترتی ہیں۔ ان کتابوں میں فوائد السالکین، راحت القلوب اور افضل الفوائد جیسی وضعی کتابوں کے حوالوں سے بہت سی ایسی باتیں نقل کی گئی ہیں جو حقیقت سے بعید ہیں۔ اسی طرح اُن کے مصنف اکثر جگہ بابا صاحبؒ کی زندگی کا کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے یوں لکھنے کے عادی ہیں کہ "نقل ہے کہ" اور محدّثین کی اصلاح میں ایسا شخص جو روائیت بیان کرے لیکن راوی کا نام چھپائے اُسے مدلس کہتے ہیں اور ایسے مصنفوں کے سوانح حیات پر طبقات المدلسین نام کی ایک کتاب موجود ہے۔ اسی طرح ان کتابوں میں افراط و تفریط بھی بہت پائی جاتی ہے بابا صاحبؒ نے بقول امیر خورد اور شیخ محدّثؒ چالیس شب چلہ معکوس کیا تھا[۱۰،۱۱] انیسویں صدی کے تذکرہ نویسوں نے چالیس شب کو پانچ سال پھر بارہ سال اور آخر میں چالیس سال بنا دیا۔

مفتی غلام سرور لاہوری کی خزینۃ الاصفیاء پر سبھی مؤرخ اور تذکرہ نویس اعتماد کرتے ہیں۔ مشہور مستشرق پروفیسر آربری نے اس کتاب کی تعریف میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یہ صوفیائے کرام کا پہلا تذکرہ ہے جو سائینٹفک

۱۰ء سیر الاولیاء، ص ۷۰، ۱۱ء اخبار الاخیار، ص ۵۳،

58903

طریقہ پہ لکھا گیا ہے۔ مفتی صاحب نے خدا جانے یہ کیسے لکھ دیا ہے کہ سلطان بلبن کی بیٹی ہزیرہ بانو بابا صاحبؒ کے حرم میں تھی۔ مفتی صاحب نے بنتِ بلبن کا نام بھی کہیں سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ مفتی صاحب کی خزینۃ الاصفیاءؒ جس کی پروفیسر آربری نے اس قدر تعریف کی ہے، رطب و یابس سے مملو ہے۔ مفتی صاحب کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں، مثلاً ایک جگہ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ جب داتا گنج بخش علی ہجویریؒ لاہور تشریف لائے تو لوگ حضرت حسین زنجانیؒ کا جنازہ اُٹھائے لیے جا رہے تھے[29]۔ دوسرے موقعہ پہ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ داتا صاحبؒ نے بقول بعض سنہ ۴۶۰ھ اور بقول بعض سنہ ۴۶۵ھ میں وفات پائی[30] اور تیسرے موقع پہ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت حسین زنجانیؒ کا انتقال سنہ ۶۰۰ھ میں ہوا[31]۔ یعنی داتا صاحب کی وفات کے ۱۴۰ یا ۱۳۵ سال بعد جب خزینۃ الاصفیاء میں اس طرح کی روایات عام ہوں تو اس پہ کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اسی سلسلہ میں سیر الاقطاب مصنفہ شیخ الہدیہ چشتی کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ اس کتاب میں بابا صاحب کا ذکر خیر سترہ صفحات پہ پھیلا ہوا ہے۔ مصنف دیباچہ میں رقمطراز ہے کہ اس نے یہ کتاب ”سن ستہ و ثلثین و الف (۱۰۳۶) میں“ حضرت ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قرآن ثانی شاہ جہان غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ“ کے عہد میں لکھی ہے[32]۔ شاہجہان ”سن سبع و ثلثین و الف

---

[29] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم، مطبوعہ کانپور ۱۹۱۴ء، ص ۲۳۴،

[30] ایضاً، ص ۲۳۴ [31] ایضاً، ص ۲۵۱

[32] شیخ الہدیہ، سیر الاقطاب، مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۳ء، ص ۲

(۱۰۳۷ء) میں تخت نشین ہوا تھا۔ کم از کم ایک ہم عصر تذکرہ نویس ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی وضعی ہے اور اس کی روایات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

آیئے اب دوسرے شواہد سے اس روایت کا تجزیہ کریں۔

۱۔ بابا صاحبؒ نے سنہ ۱۲۶۵ء میں پچانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ بابا صاحبؒ کی عمر کے متعلق امیر خورد نے ایک بار حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے سوال کیا تھا کہ "عمر شریف حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز چند سال بود؟" آپ نے ارشاد فرمایا "نود و پنج سال"[۲۳] غیاث الدین بلبن بابا صاحب کی وفات کے ایک سال بعد سنہ ۱۲۶۶ء میں تخت نشین ہوا، اگر ہم یہ کہیں کہ بلبن نے اپنے زمانۂ وزارت میں اپنی بیٹی کا عقد بابا صاحبؒ کے ساتھ کر دیا تھا تو اس وقت یہ بات ذہن میں ہونی چاہیئے کہ جب ناصر الدین محمود نے بلبن کو قلمدان وزارت سونپا تو اس وقت بابا صاحبؒ کی عمر ۷۰ سال اور بلبن کی عمر ۴۰ سال کے لگ بھگ تھی، اس طرح بلبن کی بیٹی اگر وہ بابا صاحبؒ سے منسوب ہوتی تو اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس برس ہونی چاہیئے تھی، بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کی عمروں میں اس قدر تفاوت کے پیشِ نظر یہ رشتہ طے ہونا ناممکن سا تھا۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ بلبن کے عہدۂ وزارت پر متمکن ہونے سے پہلے اس کی ایک بیٹی ناصر الدین محمود کے عقد میں تھی اور اس کی اگر کوئی دوسری بیٹی ہوتی تو وہ اور بھی کم سن ہوتی، اس طرح میرے خیال میں ایسا رشتہ ہونا ناممکن تھا۔

۲۔ کتب تواریخ میں سلطان بلبن کی اولاد کے ضمن میں فقط سلطان محمد،

---

[۲۳] سیر الاولیاء، مطبوعہ دہلی سنہ ۱۳۰۲ھ، ص ۹۱

بغراخان اور ایک بیٹی کا ذکر ملتا ہے جو ناصر الدین محمود کے حرم میں تھی۔ ان تینوں بچوں کے علاوہ اور کسی بچے کا نام کسی کتاب میں پڑھنے میں نہیں آیا، ویسے بھی بلبن موجودہ اصطلاح میں "خاندانی منصوبہ بندی" کا بڑا حامی تھا۔ سلطان بلبن کے فرزند شہزادہ بغراخان نے ایک موقعہ پر اپنے بیٹے کیقباد کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا۔

"پدر ما سلطان بلبن که در تجارب ملکی و خانی و بادشاهی پیر شده بود بارها بگفتی که من می توانم که از زنان و کنیزکان پسران و دختران بسیار بزایم و لیکن از بزرگانِ دین و دولت شنیده ام که بادشاه را پسران و دختران بسیار نشاید چه اگر ملک بدست یک پسر افتد همان پسر برادران و برادرزادگان را شریک ملک خود داند یا بر همه را بکشد و یا در اقلیم های دُور دست جلا کند ایمن نشود، و دامادان بادشاه را از جهت دختران بادشاه بوی بادشاهی در دماغ افتد و همان بوی ایشان را زنده بودن نگذارد"[۳۴]

ہمارے والد سلطان بلبن جو ملک، خان اور بادشاہ کی حیثیت سے تجربے کرتے کرتے بوڑھے ہو گئے تھے، اکثر کہا کرتے تھے کہ میری یہ بڑی خواہش تھی کہ میری بیویوں اور کنیزوں سے میرے بہت سے بیٹے اور بیٹیاں ہوتے لیکن یہ خواہش اس لئے پوری نہ ہوئی کہ ہمیں نے بزرگان دین اور اکابر سلطنت کو بارہا یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ بادشاہ کے زیادہ بیٹے اور بیٹیاں نہیں ہونے چاہئیں۔ وہ اس لئے کہ جب اس کا ملک کسی بیٹے کے قبضے میں آئے گا تو وہ اپنے دوسرے بھائیوں اور بھتیجوں کو اپنی سلطنت میں شریک سمجھے گا۔ اس صورت میں یا تو وہ ان سب کو قتل کر ڈالے گا یا انہیں جلاوطن کر کے دور دراز علاقوں میں بھیج دے گا۔ بہرصورت وہ غیر محفوظ ہوں گے اسی طرح بادشاہ کے دامادوں کے ذہنوں میں بھی، بادشاہ کی بیٹیوں کے ساتھ تعلق کی بنا پر بادشاہی کی بو سما جائے گی۔ اور یہی بو انہیں زندہ نہ رہنے دے گی۔

---

[۳۴] برنی، تاریخ فیروز شاہی، جلد اوّل، علیگڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۲

سطورِ بالا کی روشنی میں یہ بات یقینی کہی جا سکتی ہے کہ سلطان بلبن کی ایک بیٹی کے علاوہ، جو ناصر الدین محمود کے حرم میں تھی، دوسری کوئی بیٹی نہ تھی۔

۳۔ سلطان بلبن کا بڑا بیٹا شہزادہ محمد اپنے والد کی زندگی میں ملتان کا گورنر تھا اور اس کے تعلقات خاندانِ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ساتھ بڑے خوشگوار تھے، اگر اس کی بہن اجودھن میں ہوتی تو اس کے تعلقات خاندانِ فرید کے ساتھ کہیں زیادہ خوشگوار ہوتے اور وہ ملتان سے اپنی بہن یا اس کی اولاد سے ملاقات کے لیے اکثر اجودھن آیا کرتا۔ کسی تذکرہ نویس یا مؤرخ نے اس کے سفرِ اجودھن کا ذکر نہیں کیا درانحالیکہ امیر خسرو اور امیر حسن سجزی جیسے مؤرخ اور تذکرہ نویس اس کے درباری تھے۔

۴۔ بابا صاحبؒ کا امراء اور سلاطین کی طرف جو رویہ تھا وہ اس نصیحت سے عیاں ہے کہ جو آپ نے سیدی مولہ کو کی تھی، آپ فرماتے ہیں:۔

" اے سیدی تو در دہلی میروی و می	سیدی تم دہلی جا رہے ہو اور چاہتے ہو کہ وہاں
خواہی دری بکشائی و بانہ نام پیدا	دروازہ کھولو اور نام پیدا کرو۔ جو چیز اپنے
آری، تو دانی ہرچہ دران صلاح	حق میں درست و بہتر سمجھو اس کو تم جانو
و صواب خود بینی ہم چناں بکنی، اما یک	اپنے صوابدید کے مطابق ہی کر لینا لیکن میری ایک
وصیت از من نگہداری، باید کہ با ملوک	وصیت کا خیال رکھنا اور وہ یہ ہے کہ ملوک
و امراء اختلاط نہ کنی و آمد و شد ایشان	و امراء کے ساتھ اختلاط نہ رکھنا اور اپنے گھر
را در خانقاہ خویش از مہلکات تصور	میں ان کی آمد و رفت کو مہلکات میں سے تصور
کنی کہ ہر درویشی کہ در اختلاط با ملوک	کرنا جو درویش ملوک و امراء سے اختلاط کا
و امراء بکشاید عاقبت او وخیم گردد "۳۵	دروازہ کھولتا ہے اس کا انجام خراب ہوتا ہے۔

(ترجمہ پروفیسر خلیق احمد نظامی)

---

۳۵ برنی، تاریخ فیروز شاہی، جلد دوم، مطبوعہ علیگڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۳۷

سطورِ بالا کی روشنی میں بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کا رشتہ ایک مفروضہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

۵۔ بابا صاحبؒ لوگوں کو امراء و سلاطین کے پاس جانے سے روکتے تھے اگر سلطان بلبن کی کوئی بیٹی ان کے حرم میں ہوتی تو آپ لوگوں کو اس طرح کی نصیحت نہیں کر سکتے تھے۔ بصورت دیگر آپ کی مثال اس شخص جیسی ہوتی جو مسروقہ مرغی بغل میں دبا کر لوگوں کو دیانتداری اور راستبازی کی تلقین کرتا پھرے۔[۳۶]

۶۔ بابا صاحبؒ کا سلاطین اور امراء کی طرف جو رویہ تھا وہ اظہر من الشمس ہے۔ سلاطین و امراء تو رہے ایک طرف، بابا صاحبؒ خواص سے بھی کتراتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ آپ ہانسی کی سکونت ترک کر کے اجودھن چلے گئے جہاں کے باشندے درویش آثار اور گوشہ نشین مشہور تھے۔[۳۷] ایسے حالات میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ بابا صاحبؒ بلبن کی بیٹی کے ساتھ عقد کرتے۔

۷۔ بابا صاحبؒ کی زندگی اتنی درویشانہ تھی اور آپ اس حد تک قانع تھے کہ آپ نے کریر کے پھل ڈیلے کھائے، اور جھونپڑے میں گزارہ کیا، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ روزہ افطار کرنے کے لئے آپ کے خانقاہ میں چٹکی بھر نمک بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ جب آپ نے رحلت فرمائی تو آپ کے

---

[۳۶] خلیق احمد نظامی، دی لائف اینڈ ٹائمز آف شیخ فریدالدین گنج شکر، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۳،

[۳۷] امیر خورد، سیرالاولیاء، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ، ص ۶۴،

جنازہ پہ ڈالنے کے لئے گھر سے چادر بھی نہ مل سکی اور امیر خورد کی دادی نے ایک چادر اس مقصد کے لئے پیش کی، جب لحد کا منہ بند کرنے کا وقت آیا تو کچی اینٹیں بھی میسر نہ آسکیں اور خانقاہ کے کسی حجرہ کا در، جو کچی اینٹوں سے بند کیا ہوا تھا، اکھاڑ کر کام چلایا گیا۔ ایسے درویش کو جس کے زہد کا یہ عالم ہو اور جس کے گھر میں کئی کئی دن کا فاقہ ہو اور وہ عالم اضطراب میں سنگریزے منہ میں ڈال لے، جس کے متعلق محمد عوفی مندوی یہ لکھنے پہ مجبور ہو کہ۔

"ہند کے تمام مشائخ متفق اللفظ ہیں کہ ریاضت اور پرورش روح میں گنج شکرؒ کی مانند کوئی درویش پیدا نہیں ہوا" اسے بلبن جیسا قیصر صفت اور کسریٰ مزاج بادشاہ اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے تو رہا۔

۸۔ بلبن ذات پات کا بڑا قائل تھا اور نیچ ذات کے لوگوں کو دیکھنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

"من خود را از آل افراسیاب و از فرزندان
افراسیاب از آن می دانم کہ باری
تعالیٰ در من خاصیتی آفریدہ است
کہ ہیچ کم اصل و دون و سفلہ و رذالہ
را در شغل و منصب دولت نتوانم
دید، و بہ مجرد آن کہ این طائفہ در نظر
من در آیند جملہ رگہای اعضائے
من در جنبش در آید، و چون حال
برین جملہ باشد کہ با شما گفتم من نتوانم
کہ لئیم و کم اصل و ناکس زادہ را در

میں افراسیاب کی اولاد ہوں اور میرے آباؤ اجداد
کا شجرہ نسب افراسیاب سے جا ملتا ہے میں جانتا ہوں
کہ خدا تعالیٰ نے میری فطرت ایسی بنائی ہے کہ میں کسی
کم اصل، کمینے یا نیچ ذات کے فرد کو کسی سرکاری منصب پہ
نہیں دیکھ سکتا۔ جونہی ان میں سے کوئی شخص میرے
سامنے آتا ہے میری ایک ایک رگ پھڑکنے لگتی
ہے۔ جب میری یہ حالت ہو جو میں تمہارے سامنے
بیان کر رہا ہوں تو پھر یہ کس طرح ہو سکتا کہ میں
اس دولت میں جو خدا نے مجھے عطا کی ہے کسی
کمینے، ہیچ ذات کے فرد یا حرام زادے کو شریک

صدر دولتی، کہ من از خدا یافتہ ام، شریک   کرلوں اور اُسے سرکاری ملازمت یا
کنم وشغل و اقطاع وتصرف دہم"۔[۳۸]   جاگیر بخشوں۔

۹۔ باباصاحبؒ اور بلبن کے نظریات میں بعد المشرقین تھا اس لیے یہ کسی صورت بھی ممکن نہ تھا کہ ان کے درمیان اس طرح کا رشتہ قائم ہوتا۔

۱۰۔ بلبن کا اپنے مخدوم زادے اور داماد سلطان ناصرالدین محمود کے ساتھ جو سلوک تھا اس کی ایک جھلک بعض کتب تواریخ میں پائی جاتی ہے۔ بعض مؤرخ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ اس نے تمام اختیارات حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیے اور ناصرالدین محمود مجبوراً خانہ نشین ہوگیا اور اس نے وہ ریاضت اور تقویٰ اختیار کیا جو اب تک ضرب المثل ہے۔ بعض مؤرخ تو یہاں تک کہہ گئے کہ جب تمام اختیاراتِ حکومت اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیے تو تخت حکومت حاصل کرنے کے لیے اس نے ناصرالدین محمود کو زہر دے کر مار ڈالا[۳۹] اور عوام میں "غلام خواجہ کُش" کے لقب سے مشہور ہوا۔ سلطان فیروز تغلق کے متعلق روایت ملتی ہے کہ وہ دہلی کے اکثر و بیشتر سلاطین کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لیے جایا کرتا تھا لیکن بلبن کو "خواجہ کُش" سمجھتے ہوئے وہ اس کے مزار پر فاتحہ نہ پڑھتا تھا۔[۴۰]

ناصرالدین محمود کا ذکر لوگ اولیائے اللہ کے زمرہ میں کرتے ہیں۔ اگر بلبن اس جیسے ولی کو مروا سکتا ہے تو باباصاحبؒ جیسے ولی سے کب ایسی

---

[۳۸] برنی، تاریخ فیروز شاہی جلد اوّل، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۴۴

[۳۹] رحلۃ ابن بطوطہ، جلد دوم، مطبوعہ قاہرہ ۱۸۶۹ء، ص ۲۱

[۴۰] نور الحق، زبدۃ التواریخ، قلمی نسخہ، برٹش میوزیم لندن، نمبر ایڈیشنل ۱۰۵۸۰، ورق ۱۵ ب،

عقیدت رکھ سکتا تھا کہ اپنی بیٹی کا رشتہ ان کو دیتا۔

۱۱۔ اب رہی یہ بات کہ بلبن درویشوں سے عقیدت رکھتا تھا اور ان کے گھروں پہ جایا کرتا تھا اور اگر ان میں سے کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے جنازہ میں شرکت کرتا اور تعزیت کے لئے اس کے لواحقین کے پاس جاتا اور ان کو نقدی اور کپڑے عطا کرتا، ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں، وہ ضرور ایسا کرتا ہوگا، لیکن یہ اس کی نیکی کی دلیل نہیں ہے۔ بڑے بڑے جابر اور فاسق بادشاہ درویشوں سے عقیدت رکھتے تھے لیکن اس عقیدت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان سے اپنی بیٹیاں بیاہ دیتے تھے، ایسے بادشاہوں کے متعلق علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ رقمطراز ہیں۔

> "معاصی پہ اصرار کے ساتھ ساتھ ان کو صلحاء کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے اور ان سے وہ اپنے حق میں دعائیں کراتے ہیں، شیطان ان کو سمجھاتا ہے کہ اس سے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے گا، حالانکہ اس خیر سے اس شر کا دفعیہ نہیں ہو سکتا"[۴۱]

مؤرخین نے بلبن کی جس درویش نوازی کا بڑے زور و شور سے ڈھنڈورا پیٹا ہے وہ سطور بالا کی روشنی میں اس کی نیکی کی دلیل نہیں بن سکتی۔

۱۲۔ باباصاحبؒ کی وفات کے بعد باباصاحبؒ کی اولاد کے ساتھ، جو اس مفروضہ رشتہ کی بنا پہ بلبن کے نواسے ہوتے ہیں، بلبن نے اگر کوئی سلوک کیا ہوتا تو اس کا ذکر تذکروں میں ضرور ہوتا، آخر ان میں سے سبھی تو ایسے درویش

---

[۴۱] ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ اول، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء، ص ۲۱۰ (مولانا علی میاں نے مقتد مسالک الولاۃ والسلاطین کا حوالہ دیا ہے جو لاہور میں موجود نہیں)

صفت نہ تھے جو ہدیہ سلطانی کو رد کر دیتے ۔ بابا صاحبؒ کے ایک فرزند نظام الدینؒ تو سرکاری ملازمت کو عار نہ سمجھتے تھے کم از کم وہ تو جاگیر قبول کر لیتے ۔

۱۳۔ اگر واقعی بابا صاحبؒ نے بلبن کی بیٹی سے عقد کیا تھا تو اس کا ذکر حضرت نظام الدین اولیاءؒ یا شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے کیوں نہیں کیا ؟

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہاں تک مستند تاریخی شواہد اور براہین کا تعلق ہے حضرت بابا صاحبؒ کے ساتھ سلطان غیاث الدین بلبن کی کسی بیٹی کی نسبت محض ایک افسانہ ہے اور حقیقت سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ۔

فضل اللہ بن روزبہان اصفہانیؒ

اور

ان کا ایک نادر رسالہ

ابوالخیر فضل اللہ بن جمال الدین روزبہان[1] بن فضل اللہ[2]، الخنجی، الشیرازی، الاصفہانی، المتخلص بہ امین[3]، المشہور بہ خواجہ مولانا اصفہانی[4]، شیراز میں ۸۵۰ھ/ ۱۴۴۶ء میں پیدا ہوئے۔

مولانا فضل اللہ کا سال پیدائش ابھی تک متنازعہ فیہ ہے۔ ان کے ہم عصر اور استاد شہرۂ آفاق محدث شمس الدین محمد السخاویؒ نے ان کے سوانح حیات اپنی مشہور عالم تصنیف الضوء اللامع میں بڑی تفصیل کے ساتھ قلمبند کئے ہیں لیکن ان کے سال پیدائش کے متعلق انھیں بھی یقین نہیں تھا۔ اس لئے آپ نے ان کی ولادت ۸۶۰ - ۸۵۰ھ/ ۱۴۴۶ - ۱۴۵۶ء کے درمیان

---

[1] فضل اللہ، تاریخ عالم آرائے امینی، مخطوطہ فاتح لائبریری استانبول، ورق ۹۸ الف

[2] فضل اللہ، مہمان نامۂ بخارا، مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء، ص ۳۵۶

[3] ایضاً۔ ص ۷۵، ۱۳۱، ۱۳۶، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۵۹، ۳۲۱، ۳۳۸

[4] فضل اللہ، مہمان نامۂ بخارا۔ ص ۳۵۶۔

بتائی ہے۔[5] عصر حاضر کے ادیب شہیر عمر رضا کحالہ کے خیال کے مطابق آپ ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء میں پیدا ہوئے۔[6] تاریخ عالم آرائے امینی کے انگریزی ترجمہ کے دیباچے میں ایک فٹ نوٹ میں پروفیسر مینورسکی تحریر فرماتے ہیں کہ فضل اللہ ۸۷۷ھ/۱۴۷۲ء میں بغداد میں وارد ہوئے اس لیے گمان غالب ہے کہ وہ اندازاً ۲۵ سال کی عمر میں اصفہان سے نکلے ہوں گے اس لحاظ سے ان کی پیدائش ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء کی ہونی چاہیئے۔[7] کچھ عرصہ بعد حسن اتفاق سے پروفیسر مینورسکی کو خود مولانا فضل اللہ کی تصنیف تاریخ عالم آرائے امینی سے ایک شہادت مل گئی جس سے یہ ثابت ہوا کہ مولانا ۲۵ برس کی عمر میں ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء میں اصفہان سے نکلے تھے اس حساب سے ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء مولانا کا سال پیدائش ہے۔[8]

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل اللہ شافعی المذہب علما کے ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس کے افراد پشتہا پشت سے عہدہ قضا پر فائز چلے آ رہے تھے۔ ہر چند فضل اللہ نے اپنے والد اور دادا کے علاوہ اپنے کسی مورث اعلیٰ کا ذکر نہیں کیا تاہم ان کے والد کے غیر معمولی نام روزبہان کا تعلق فسا اور خنج کے اسی نام کے ایک خاندان سے جوڑا جا سکتا ہے۔[9] یہ فسا وہی شہر ہے جہاں کی خاک پاک سے شہرۂ آفاق صوفی اور عالم حضرت[10]

---

[5] السخاوی، الضوء اللامع، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۴ھ ج ۶ ص ۱۷۱

[6] عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین مطبوعہ دمشق ۱۹۵۹ء جلد ۸، ص ۶۸۔

[7] مینورسکی۔ پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸ تا ۱۴۹۰ مطبوعہ لندن ۱۹۵۷ء ص ۲۔ [8] ایضاً ص ۱۲۷

[9] جنید شیرازی۔ شد الازار، مطبوعہ تہران ۱۹۴۹ء۔ ص ۱۷۱ تا ۱۷۵

روزبہان بن ابی نصر البقلیؒ (م ۶۰۶/۱۲۱۰) پیدا ہوئے تھے۔[۱۰] حسن نسائی نے اپنی قابل قدر تصنیف فارس نامۂ ناصری میں ایک اور عالم زین العابدین علی بن روزبہان (م ۷۰۴/۱۳۰۴) کا ذکر کیا ہے جو اپنے دور میں مولانا فضل اللہ کے آبائی وطن خنج میں عہدۂ قضا پہ فائز تھے۔[۱۱]

فضل اللہ اپنی مشہور تصنیف تاریخ عالم آرائے امینی میں اپنے والد "جمال الحق والحقیقت روزبہان" کے متعلق رقم طراز ہیں کہ وہ سرداروں کے زمرہ میں داخل تھے لیکن ان پہ کچھ ایسی گزری کہ انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے اوقات پڑھنے لکھنے میں بسر کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کا شمار ان علماء میں ہونے لگا جن پہ سلطان یعقوب (م ۱۴۹۰ء) کی نظر عنایت رہتی تھی۔[۱۲]

فضل اللہ اپنی والدہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ وہ اصفہان کے ممتاز گھرانے صاعدی کی فرد تھیں۔[۱۳] یہ خاندان اپنی علم دوستی اور علمی سرپرستی کے لئے ایران بھر میں مشہور تھا۔ کمال اسمٰعیل اصفہانی جیسا صاحب کمال اور نامور شاعر اسی خاندان کے دسترخوان کرم کا ریزہ چین تھا اور اس نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۶ قصائد اس خاندان کے مختلف افراد کی مدح میں لکھے ہیں۔[۱۴] فضل اللہ کا ایک ماموں جمال الدین صاعدی شیراز کے

---

[۱۰] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی ورق ۲۰۰ ب۔

[۱۱] حسن فسائی فارس نامہ ناصری، مطبوعہ تہران ۱۳۱۱ھ ش جلد دوم۔ ص ۱۹۰

[۱۲] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی ورق ۸۹ الف

[۱۳] ایضاً ورق ۶۶ الف

[۱۴] کمال اسمٰعیل اصفہانی، دیوان، مطبوعہ بمبئی، ص ۱۲، ۱۵، ۱۷۔

قراقیونلو حاکم پیر بوداق بن جہان شاہ کے دور میں عہدۂ وزارت پر فائز تھا۔[15] فضل اللہ کا دوسرا ماموں مسعود شاہ شیراز کے حاکم جہان شاہ کا منظورِ نظر تھا جسے اس نے اپنے قبیلے کی سرداری کے علاوہ نقارہ و علم بھی عطا کیا تھا۔[16] جہاں شاہ کے انتقال کے بعد مسعود شاہ ہمیں سلطان یعقوب کے دربار میں نظر آتا ہے جہاں حسبِ سابق اس کی ساکھ قائم تھی۔[17] فضل اللہ نے اپنے ایک قریبی عزیز خواجہ نظام الدین احمد صاعدی کا ذکر بھی کیا ہے جس کے دسترخوان کرم سے ہر روز اندازاً ایک ہزار درویشوں کو کھانا ملتا تھا۔[18] اس کا ایک دوسرا رشتہ دار قاضی عضد الاسلام صاعدی گرجی عیسائیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہوا تھا۔[19]

فضل اللہ کی انہی رشتہ داریوں کے پیشِ نظر پروفیسر مینورسکی قمطراز ہیں کہ ان پر غور کرنے سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو سنی عقائد کے علمبردار تھے۔[20] ایک دوسرے موقع پر موصوف نے فضل اللہ کو سنی مذہب کے فاضل علمبردار کے لقب سے بھی یاد فرمایا ہے۔[21] مولانا کے یہی عقائد ان کے مخالفین کے دل میں کھٹکتے رہتے

---

[15] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی، ورق ۶۶ الف

[16] ایضاً ورق ۶۶ الف

[17] ایضاً ورق ۶۷ الف

[18] ایضاً ورق ۱۸۶ ب

[19] ایضاً ورق ۱۷۶ الف

[20] مینورسکی۔ پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸۔ ۱۴۹۰ ص ۲

[21] مینورسکی۔ بولیٹن سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز، جلد ۱۶، ۱۹۵۵ء ص ۴۶۱۔

تھے اور اس کا اندازہ حسن روملو کی احسن التواریخ کے مطالعہ سے ہوتا ہے جس میں اس نے مولانا کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک متعصب سنی اور شیبانی خان کے درباری تھے اور اہلِ بیت کے ساتھ اپنی دشمنی کے لئے رسوائے عالم تھے۔[22] زمانہ حال کے ادیبوں میں سے پروفیسر براؤن[23] اور اسٹوری[24] نے بھی مولانا فضل اللہ کو جھگڑالو اور متعصب سنی لکھا ہے۔

اس زمانے میں شیراز کا شمار دنیائے اسلام کے گنے چنے عالمی مراکز میں ہوتا تھا اور اس دور کے بلاشبہ سب سے بڑے شافعی فاضل مولانا جلال الدین دوانیؒ وہاں درس دیا کرتے تھے۔ مولانا فضل اللہ کی یہ بڑی سعادت تھی کہ انھیں برسوں دوانی کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔[25] محدث السخاوی نے ان کے اساتذہ میں عمید الدین شیرازی کا بھی ذکر کیا ہے۔[26] فضل اللہ تاریخ عالم آرائے امینی کے آغاز میں رقم طراز ہیں کہ انھوں نے علوم عربیہ کی تعلیم شیراز میں پائی اور سترہ برس کی عمر میں حج کی نیت سے عازم حجاز ہوئے۔[27] ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حج بیت اللہ کے بعد وہ شیراز واپس لوٹ لئے تھے۔

زمانے کے دستور کے مطابق فضل اللہ نے نوجوانی کے عالم میں سہروردیہ

---

[22] حسن روملو۔ حسن التواریخ۔ مطبوعہ بڑودہ سنہ ۱۹۳۱ء ص ۱۷۴

[23] براؤن، اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، مطبوعہ کیمبرج سنہ ۱۹۳۰ء جلد چہارم، ص ۴۰۸، ۴۰۷

[24] اسٹوری، پرشین لٹریچر، مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۲۷ء جلد اول، ص ۳۰۰

[25] فضل اللہ مہمان نامۂ بخارا۔ مطبوعہ تہران سنہ ۱۹۶۲ء۔ ص ۳۳۵

[26] السخاوی، الضوء اللامع۔ مطبوعہ قاہرہ۔ سنہ ۱۳۵۴ھ جلد ششم ص ۱۷۱

[27] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی، ورق ۳۰ ب تا ۳۵ الف

سلسلہ کے ایک بزرگ پیر جمال الدین صوفی جمالی اردستانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی[۲۸]۔ پیر جمال الدینؒ، جن کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزرا تھا، اپنے دور کے سربرآوردہ شعراء میں شمار ہوتے تھے[۲۹]۔ ان کی کلیاتِ قلمی جس میں ۲۴ مثنویات کے علاوہ رباعیات، غزلیات اور مفردات بھی شامل ہیں، کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ پروفیسر نکلسن نے پروفیسر براؤن کے مخطوطات کی فہرست میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ بہت ہی نادر منظوم شاہکار" ہے[۳۰]۔ پیر جمال الدینؒ کی کلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے مرید فضل اللہ سے خاص لگاؤ تھا اور وہ اپنے خطوط میں ان کو فرزند کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ دوسروں کے نام خطوط میں بھی وہ اکثر ان کا اور ان کی ہمشیرہ کا ذکر بڑے پیار و محبت سے کیا کرتے تھے[۳۱]۔

پیر جمال الدینؒ کی بیعت کے بعد فضل اللہ نے تصوف کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی نگرانی میں منازلِ سلوک طے کرنے لگے۔ دوسرے سفر حجاز میں فضل اللہ نے بڑی رغبت کے ساتھ شیخ ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی عوارف المعارف کا مطالعہ کیا[۳۲]۔

---

[۲۸] ابن سکندر۔ بستان سیاحت مطبوعہ تہران ۱۸۹۰ء ص ۲۴۸

[۲۹] (۱)، رضا قلی خان۔ ریاض العارفین، مطبوعہ تہران [illegible] ص ۵۳۔۵۴ (۲) پیر جمال کلیات، قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری نمبر ۱۲-۲۳۸ ورق ۳۰۱ الف، ۳۰۵ ب

[۳۰] (۱) نکلسن۔ فہرست مخطوطات براؤن کیمبرج ۱۹۳۲ء ص ۲۳۹ (ب)، نکلسن۔ عجب نامہ، کیمبرج ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۶۴ تا ۲۷۰

[۳۱] پیر جمال۔ کلیات۔ ورق ۳۱۱ الف، ۳۱۲ ب

[۳۲] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی۔ ورق ۳۰ ب تا ۳۵ الف

۲۵ سال کی عمر میں ۸۷۵ھ - ۱۴۷۱ء میں فضل اللہ اپنی والدہ اور پیر جمال الدینؒ کو ساتھ لے کر تلاش علم میں مصر کی جانب روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں قاہرہ میں شیخ محمد الجعفریؒ (م $\frac{۹۰۴}{۱۴۹۹}$) کے علم و فضل کا بڑا چرچا تھا اور یہ فضل اللہ کی سعادت تھی کہ انھیں شیخ موصوف کے درس میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا[۳۳]۔ ادھر فضل اللہ نے اپنی تعلیم مکمل کی ادھر ان کی والدہ انتقال کر گئیں اور وہ بد دل ہو کر اپنے پیر و مرشد کی معیت میں فلسطین کی طرف روانہ ہوئے۔ بیت المقدس پہنچتے ہی پیر جمال الدینؒ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کی تجہیز و تکفین کے بعد فضل اللہ نے مدینہ منورہ کی راہ لی[۳۴]۔

ان دنوں مدینہ منورہ میں شہرۂ آفاق محدث شمس الدین محمد عبد الرحمن السخاویؒ مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور دُور دُور سے تشنگانِ علم ان سے سندِ حدیث لینے آتے تھے فضل اللہ نے بھی ان سے بخاری شریف کا درس لیا اور جس دن انہیں سندِ حدیث ملی اس دن اُنھوں نے عربی میں ایک زوردار قصیدہ اپنے استاد کی مدح میں لکھا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد جب محدث السخاوی الضوء اللامع میں اپنے شاگردِ رشید کے حالات قلم بند کرنے بیٹھے تو وہ قصیدہ ان کے پاس موجود تھا[۳۵]۔

اس زمانہ میں مدینہ منورہ میں ایک اور بزرگ ابو عبد اللہ محمد بن ابو الفرجؒ بھی حدیث کا درس دیا کرتے تھے، فضل اللہ نے ان کی خدمت میں رہ کر مسلم شریف کی سند حاصل کی[۳۶]۔

---

[۳۳] (۱) السخاوی، الضوء اللامع، جلد چہارم۔ ص ۱۷۱ (۲) فضل اللہ نے سلوک الملوک میں ۸۸۶ھ میں اپنے قیام مصر کا ذکر کیا ہے (مخطوطہ لینن گراڈ، ورق ۴۳ الف)

[۳۴] السخاوی، الضوء اللامع، جلد چہارم ص ۱۷۱ [۳۵] و [۳۶] ایضاً۔

امام محمد بن ادریس الشافعیؒ کے مقلدین میں امام محمد غزالیؒ بلا شبہ سب سے بڑے عالم ہوئے ہیں اس لیے شافعی المذہب ہونے کی بنا پر فطرتاً فضل اللہ کا رجحان ان کی طرف تھا۔ قیام حجاز کے دوران انھیں امام غزالی کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا اور انھوں نے منہاج العابدین اور احیاء العلوم کا مطالعہ بڑے شوق اور انہماک سے کیا۔[۳۷]

حجاز مقدس میں تکمیل تعلیم کے بعد فضل اللہ شیراز واپس لوٹے اور یہاں آتے ہی انھوں نے "بدیع الزمان فی قصۃ حی ابن یقظان" تالیف کی۔ اسی دوران ان کا دل کسی وجہ سے "آب رکنا باد اور گل گشت مصلّٰی" سے اُچاٹ ہوا اور انھوں نے حجاز مقدس میں جا بسنے کی ٹھان لی لیکن عین آخر وقت پر حجاز کی بجائے وہ سلطان یعقوب سے ملنے کی غرض سے آذربائیجان روانہ ہوئے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ فضل اللہ کے والد جمال الدین روزبہان سلطان موصوف کے منظورِ نظر علماء میں سے تھے اس لیے بغیر کسی دشواری کے شعبان ۸۹۲ھ / اگست ۱۴۸۷ء میں کوہ سہند کے گرمائی کیمپ میں سلطان کی خدمت میں باریاب ہوئے اور اپنی کتاب بدیع الزمان اس کی خدمت میں نذر گزرانی۔ سلطان نے فضل اللہ کو اپنا کاتب بنا کر ان کی عزت افزائی کی اور شاہی روزنامچہ لکھنے کی خدمت ان کے سپرد کی۔ آپ نے یہ خدمت قبول کرتے ہوئے سلطان کو یقین دلایا کہ خدا کو منظور ہوا تو اس روزنامچہ کے سامنے جوینی کی تاریخ جہانگشای کی آب وتاب ماند پڑ جائے گی۔[۳۸]

---

[۳۷] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی ورق ۳۰ ب تا ۳۵ الف۔

[۳۸] ایضاً

چار سال تک مولانا فضل اللہ بحیثیت کاتب سلطان یعقوب کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس دوران میں متعدد بار آپ نے اہم دستاویزات تیار کیں۔ ۸۹۲ھ/۱۴۸۶ء میں سلطان اصفہان کے دورہ پر آیا تو اس نے وہاں کے سربرآوردہ لوگوں کو انعام واکرام سے نوازا۔ مولانا فضل اللہ کو بھی ان کی خدمات کے عوض خلعتِ فاخرہ اور گھوڑا عطا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ان کی تنخواہ میں بھی معقول اضافہ کیا۔[۳۹]

۸۹۲ھ/۱۴۸۶ء میں سلطان یعقوب نے بیت اللہ کے لیے غلاف تیار کروایا تو فضل اللہ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اس بات کا اعلان کریں کہ جو لوگ محمل کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے جانا چاہیں ان کی مدد سرکاری خزانے سے کی جائے گی۔[۴۰] اسی سال سلطان نے اپنے بیٹے کا ختنہ کیا تو اس تقریب پر سلطان حسین بالقیرا نے اپنا سفیر تحفے تحائف اور خط دے کر سلطان یعقوب کی خدمت میں بھیجا۔ سلطان نے فضل اللہ کو حکم دیا کہ وہ اس خط کا جواب تحریر کریں۔[۴۱] اسی سال جب سلطان یعقوب نے اپنا سفیر حاکم مصر ملک الاشرف ابوالنصر سیف الدین قائیتبای کے دربار میں بھیجا تو اس کے ہاتھ جو خط ملک الاشرف کے نام بھیجا تو وہ بھی فضل اللہ ہی سے لکھوایا تھا۔[۴۲]

رمضان ۸۹۳ھ/اگست ۱۴۸۸ء میں سلطان یعقوب نے ایک شاہی فرمان کی رو سے اپنی قلمرو میں شراب کے استعمال پہ پابندی لگا دی اور ہر چھوٹے بڑے شہر میں "لوگوں کے گھروں کو شراب کے پیالوں سے پاک

---

[۳۹] ایضاً ورق ۱۳۱ الف [۴۰] ایضاً ورق ۱۱۶ ب

[۴۱] ایضاً ورق ۱۲۸ ب [۴۲] ایضاً ورق ۱۱۸ الف و ب

رکھنے کے لیے" محتسب مقرر کیے۔ اس موقع پر فضل اللہ بڑی مسرت کے ساتھ لکھتا ہے کہ اس فرمان کے ذریعے یہ قرار پایا کہ "جو شخص بھی پیالہ میں شراب انڈیلتا ہوا پکڑا جائے تو محافظانِ شریعت اس کے حلق میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل کر اس کی زندگی کا جام خالی کر دیں اور اگر کوئی ڈاڑھی منڈوا کر اپنا چہرہ بے نور کرے تو اس کا سر کاٹ کر اس کی زندگی کا چراغ بے نور کر دیا جائے"[۴۳]

اگلے ہی سال سلطان نے "تیزۂ دین" تیز کرتے ہوئے یہ حکم جاری کیا کہ احکامِ شریعت پر سختی کے ساتھ عمل کیا جائے اور خلفائے راشدین کے طریقے کے خلاف جو رسم و رواج پائے جاتے ہیں انھیں فوراً ختم کیا جائے[۴۴]۔

ایسے پاکیزہ ماحول میں فضل اللہ نے چار سال بسر کیے اور اس دوران میں نظامِ سلطنت میں بہت سی تبدیلیاں مشاہدہ کیں۔ محکمۂ عدل میں بہت سی اصلاحات کی گئیں اور شریعت کی ترویج کے لیے سلطان کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ احکامِ شریعت کے نفاذ کے لیے ہر شہر اور قصبے میں محتسب اور شیخ متعین ہوئے۔ قاضی عیسیٰ نے بحیثیت وزیر اعظم ملک کے طول و عرض میں جو زرعی اصلاحات کی تھیں فضل اللہ نے بڑے قریب سے ان کا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ سلطان یعقوب اپنی رعایا کے ساتھ نیکی کا سلوک کیا کرتا تھا اور لہو و لعب سے باز رہ کر حتی الوسع احکامِ شریعت پر عمل کیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ علما اور فضلا کا بڑا قدر دان تھا[۴۵]۔

---

[۴۳] ایضاً ورق ۱۶۶ ب۔ [۴۴] ایضاً ورق ۱۸۲ الف۔

[۴۵] مینورسکی بلیٹن سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز لندن جلد ۱۷/۳ ۱۹۵۵ء ص ۴۵۹

قاضی عیسٰی نے نظامِ سلطنت میں جو اصلاحات کی تھیں فضل اللہ نے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ آئندہ زندگی میں جب عبید اللہ خان ازبک نے ان سے استدعا کی کہ وہ اسے ایسی کتاب تیار کر دیں جس پر عمل کر کے وہ بحیثیت حکمران نفاذِ شریعت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے تو اس وقت اپنے سابقہ مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر ان کی رائے میں پختگی آ چکی تھی اور ان کی معلومات محض سنی سنائی باتوں پر مبنی نہ تھیں۔

سلطان یعقوب نے ۲۴ر دسمبر ۱۴۹۰ء کو وفات پائی اور اس سانحہ کے بعد انتظامِ سلطنت میں بدنظمی کا دور دورہ شروع ہوا۔ ان حالات میں فضل اللہ اپنی ذمہ داریوں سے مستعفی ہو کر اصفہان چلے آئے، جہاں وہ تصنیف و تالیف میں اپنا وقت گزارنے لگے۔ اسی زمانے میں شاہ اسمٰعیل صفوی آذربائیجان کے مطلع پر نمودار ہوا۔ جونہی ۲۳ر دسمبر ۱۵۰۳ء کو مولانا فضل اللہ نے کاشان میں مشہور شیعی عالم علامہ حسن مطہر الحلّی (م ۱۳۴۵ء) کی کتاب نہج الحق کا رد کتاب ابطال نہج الباطل و اہمال کشف العاطل کے نام سے مکمل کیا اسی روز عراقِ عجم پر شاہ کے "منحوس قبضہ" کی خبر کاشان پہنچی۔

ان حالات میں بقول فضل اللہ ہجرت کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آتی تھی لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ایران سے نکل کر کہاں سر چھپایا جائے؟ خراسان کے تیموری حکمرانوں کے شاہ اسمٰعیل کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے اس لئے ان کے دربار میں فضل اللہ کو اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی سوچ و فکر کے دوران مولانا کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ماوراء النہر کا حاکم شیبانی خان کٹر سنّی ہونے کی وجہ سے مولانا کا ہم مسلک اور شاہ کا سخت ترین مخالف تھا اس لئے مولانا نے اس کے دربار کی راہ لی۔ ۱۵۰۳ء میں

مولانا فضل اللہ شیبانی خان کے مصاحبوں اور اس کے دربار کے سربرآوردہ علماُ کی صف میں نظر آتے ہیں۔[۴۶]

شیبانی خان علماُ و فضلا کا قدردان ہونے کے علاوہ بذاتِ خود بڑا پڑھا لکھا اور صاحبِ ذوق حکمران تھا۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطعات آج بھی پیرس کے کتب خانہ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اکثر اوقات وہ دوسرے علماُ کی موجودگی میں مولانا فضل اللہ کے ساتھ علمی مسائل پر گفتگو کیا کرتا تھا۔[۴۷]

بعض اوقات خراسان اور ماوراء النہر کے علماء کی موجودگی میں خان موصوف مولانا سے ہی درخواست کیا کرتا تھا کہ وہ کسی علمی یا مذہبی مسئلہ پر گفتگو کا آغاز کریں۔[۴۸] ایسی مجالس میں موقع پاتے ہی مولانا شیبانی خاں کو شاہ اسمٰعیل کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے پر اُبھارتے۔[۴۹] جو ان کے خیال میں صلیبیوں سے بڑھ کر گمراہ اور بے دین تھا۔[۵۰]

اپنی ترکی غزل میں، جو شیبانی خان نے عید الفطر کی صبح لکھی تھی، وہ مولانا فضل اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے ایسی ہی علمی مجالس کا ذکر کرتا ہے۔[۵۱]

بعض اوقات جب خراسان اور ماوراالنہر کے علما کسی مذہبی مسئلے پر خان موصوف کو مطمئن نہ کر سکتے تھے تو وہ مولانا کو بلا کر ان سے صحیح جواب طلب کیا کرتا تھا۔[۵۲] کبھی کبھار خان ان سے خلوت میں ملاقات کرتا

---

[۴۶] فضل اللہ، مہمان نامۂ بخارا مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء۔ ص ۳۲

[۴۷] ایضاً ص ۳ تا ۳۱، ۶۱ [۴۸] ایضاً ص ۱۲، ۱۴، ۱۵. ۱۷، ۱۹، ۲۹

[۴۹] ایضاً ۱۰۵، ۱۰۶ [۵۰] فضل اللہ۔ مہمان نامۂ بخارا مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء ص ۵۰۔۴۹

[۵۱] ایضاً ۱۹۷ [۵۲] ایضاً ص ۲۳، ۲۹۶

اور ایسے مواقع پر ان کو اپنے ساتھ کھانے میں بھی شریک کر لیتا تھا۔[۵۳] اگر کبھی علالت کی بنا پر مولانا دربار سے غیر حاضر ہوتے تو خان اپنے کسی مصاحب کو بھیج کر ان کی مزاج پرسی کیا کرتا تھا۔[۵۴] ایک بار جب مولانا خان کے ساتھ قزاقوں کے خلاف مہم میں شریک ہوئے تو اثنائے سفر علیل ہو گئے۔ خان بار بار ان کی مزاج پرسی کے لئے کسی نہ کسی شخص کو ان کے پاس بھیجتا تھا۔ علاوہ ازیں خان نے اپنے ذاتی معالج مولانا زائری کو ان کے معالجے کا حکم دیا۔[۵۵] جب مولانا صحت یاب ہو کر خان سے خواجہ احمد یسویؒ کے مزار مبارک پر ملے تو خان اٹھ کر ان سے گلے ملا۔[۵۶]

قزاقوں کے خلاف مہم پر روانہ ہونے سے قبل سلطان نے علماء سے مشورہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ قزاقوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کریں۔ علماء نے بشمول مولانا فضل اللہ فتویٰ جہاد پر اپنی اپنی مہریں ثبت کر دیں۔[۵۷]

ایک بار خان موصوف نے اپنے بیٹے تیمور سلطان کو حکم دیا کہ وہ تمام قضاۃ اور صوبہ داروں کے نام یہ فرمان جاری کرے کہ آئندہ سے یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے حصّہ دیا جائے۔ اس موقع پر مولانا فضل اللہ میدانِ عمل میں کودے اور اُنھوں نے حدیث اور فقہ کے دلائل سے خان کو قائل کر کے وہ حکم واپس لینے پر مجبور کر دیا۔[۵۸]

ایک بار خان نے جمعہ کے روز آپ کو حکم دیا کہ اس کی موجودگی میں وہ

---

[۵۳] ایضاً ص ۱۳۳
[۵۴] ایضاً ص ۹۳
[۵۵] ایضاً ص ۱۳۹-۱۴۰
[۵۶] ایضاً ۲۵۹
[۵۷] ایضاً ص ۴۳
[۵۸] ایضاً ص ۲۶، ۲۸

خطبۂ جمعہ ارشاد فرمائیں۔ مولانا نے اپنے خطبہ میں خان کو بحیثیت حکمران اپنے فرائض سے آگاہ کرتے ہوئے اُسے حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم پہ چلنے کا مشورہ دیا۔[۵۹] ایک دوسرے موقع پہ خان نے آپ کو ایک انکوائری کمیشن کا صدر بنا کر اساتذہ اور طلبہ کے معاملات میں تحقیق کرنے کا حکم دیا۔ آپ کی سفارش پہ خان نے اساتذہ کا مشاہرہ بڑھاتے ہوئے طلبہ کے لئے وظائف جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔[۶۰]

عام طور پہ مولانا فضل اللہ جامع مسجد سمرقند، مدرسہ شیبانی خان اور موضع خرتنگ میں امام بخاریؒ کے مزار پہ حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور ان کے اپنے الفاظ میں دُور دُور سے ہزاروں طلبہ ان سے حدیث کا درس لینے آیا کرتے تھے۔[۶۱] جب کبھی مولانا شیبانی خان کے ساتھ سفر پہ جاتے تو طلبہ کا جمِ غفیر ان کے ہم رکاب رہتا اور اثنائے سفر بھی وہ درس حدیث جاری رکھتے۔[۶۲] دیکھتے ہی دیکھتے مولانا کے شاگرد ماوراء النہر اور ترکستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور اُنہوں نے ہر جگہ حدیث اور دوسرے علوم شریعت کا درس جاری کیا۔[۶۳] تذکرۂ حسن نثاری کے مصنف کے قول کے مطابق ماوراء النہر کے اکثر و بیشتر علمائے نے مولانا فضل اللہ کے حضور میں زانوئے تلمذ طے کیا تھا۔[۶۴] خود عبید اللہ خان ازبک والیٔ بخارا نے حصن حصین مولانا سے پڑھی تھی، اور دورانِ تدریس وہ ہمیشہ خان موصوف کو قزلباشوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دیا کرتے تھے۔[۶۵]

---

[۵۹] ایضاً ص ۲۳ [۶۰] ایضاً ص ۳۰۶ [۶۱] ایضاً ص ۶۷ [۶۲] ایضاً ص ۲۵۴، ۲۵۵، ۳۴۲ [۶۳] ایضاً ص ۲۶۰، ۲۶۶ [۶۴] مینورسکی۔ پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸ - ۱۴۹۰ مطبوعہ لندن ۱۹۵۷ء ص ۴۸ پروفیسر مینورسکی نے تذکرہ حسن نثاری کے روسی ترجمہ کا حوالہ دیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب میری دسترس سے باہر ہے۔ [۶۵] فضل اللہ۔ مہمان نامۂ بخارا، ص ۵۶

وسط ایشیا کے بے شمار علماء نے مولانا فضل اللہؒ سے روایت حدیث کی اجازت لی[66] علاوہ ازیں خود ان کے الفاظ میں حجاز، مصر، شام، آذربائیجان، دیار بکر، عراق، فارس، خراسان، ماوراء النہر اور ترکستان کے بیشمار لوگوں نے ان سے قصیدہ بردہ پڑھنے کی اجازت لی اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی شمار سے باہر تھی جنھوں نے قصیدہ بردہ کے متن کو مولانا کے متن سے ملا کر صحیح کیا[67]

ماوراء النہر کے قیام کے دوران مولانا نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ کے عالم ہی تسلیم کئے جاتے تھے بلکہ عوام ان کو ایک خدا رسیدہ درویش بھی سمجھتے تھے[68] ان کے اپنے بیان کے مطابق نقشبندیہ سلسلہ کے شہرۂ آفاق بزرگ خواجہ ناصر الدین عبید احرارؒ کے مرید بھی ان کی خدمت میں کسب فیض کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے[69]

۱۵۰۹ء میں فضل اللہؒ نے شیبانی خاں کی معیت میں مشہدِ مقدس میں امام علی رضاؒ کے مزار کی زیارت کی اور زیارت سے فارغ ہوتے ہی خان موصوف سے رخصت لے کر آپ امام غزالیؒ کے مزار کی زیارت کے لئے طوس روانہ ہو گئے[70] طوس میں چند روز قیام کے بعد آپ ہرات چلے گئے۔

---

[66] ایضاً ص ۳۵۶ [67] فضل اللہؒ۔ شرح قصیدۂ بردہ، مخطوطہ ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری نمبر ۱۰۵، ورق ۳۱ الف، ۳۲ ب۔

[68] مینورسکی۔ پرشیا ان اے ڈی ۱۴۷۸ ــ ۱۴۹۰، ص ۴ (پروفیسر مینورسکی نے تذکرہ حسن نثاری کا حوالہ دیا ہے)

[69] فضل اللہؒ۔ مہمان نامۂ بخارا، ص ۲۵۱ [70] ایضاً ص ۳۳۹

جب ۲۳ رجمادی الاوّل ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء میں آپ نے مہمان نامہ بخارا مکمل کی تو آپ ہرات میں ہی قیام پذیر تھے[41]

فضل اللہ نے آٹھ برس شیبانی خاں کے دربار میں بسر کئے۔ مہمان نامہ بخارا کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ دور ان کی زندگی کا بہترین دور تھا۔ بدقسمتی سے ۲ دسمبر ۱۵۱۰ء کو شیبانی خاں نے مرد کے مقام پر اسمٰعیل صفوی سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا[42] اور اس کی شہادت کے بعد اسمٰعیل کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے ازبک ترکستان کی طرف چلے گئے۔

اسی اثنا میں بابر نے اسمٰعیل کی بھیجی ہوئی فوج کی مدد سے ماوراء النہر پر قبضہ کر کے سمرقند کو اپنا پایۂ تخت بنایا[43]۔ بابر نے اسمٰعیل کے ساتھ اپنے وعدہ کے مطابق شیعہ علما کو اپنے عقائد کی تبلیغ کے لئے خاص مراعات دیں اور اس کے علاوہ اپنے سکوں پر ائمہ اثنا عشر کے نام منقوش کروائے[44]۔ ماورا النہر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی مساجد میں ایک شیعہ حکمران یعنی شاہ اسمٰعیل صفوی کا نام خطبہ میں پڑھا گیا[45]۔ فضل اللہ ان دنوں سمرقند میں قیام پذیر تھا بلکہ بقول اس کے وہ "ملحدوں" میں رہنے پہ مجبور تھا[46]۔ یہ زمانہ بلاشبہ

---

[41] الفباص ۲۵۶ [42] غلام سرور، ہسٹری آف شاہ اسمٰعیل صفوی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۳۹ء، ص ۱۰۲

[43] اسکندر منشی۔ تاریخ عالم آرائے عباسی، مطبوعہ تہران ۱۳۱۴ شمسی جلد اول، ص ۳۰

[44] لین پول۔ کیٹلاگ آف اورینٹل کوئنز ان دی برٹش میوزیم، مطبوعہ لندن ۱۸۹۰ء جلد پنجم ص ۱۶۳

[45] اسکندر منشی۔ تاریخ عالم آرائے عباسی، جلد اول، ص ۳۰۔

[46] فضل اللہ۔ سلوک الملوک، مخطوطہ لینن گراڈ، ورق ۷، ب۔

فضل اللہ کی زندگی کا بدترین دور تھا۔

دو سال بعد ۱۵۱۲ء میں فضل اللہ کے شاگرد رشید عبید اللہ خان ازبک نے بابر کے حلیف اور ایرانی سپاہ کے قائد نجم ثانی کو غجدوان کے مقام پر شکست دے کر قتل کر ڈالا اور بابر سے دو دو ہاتھ کرنے کے ارادہ سے سمرقند کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں وہ یسی کے مقام پر حضرت خواجہ احمد یسوی کے مزار پر دعا کے لئے حاضر ہوا اور وہیں اس نے خواجہ کو گواہ بنا کر خدا سے یہ وعدہ کیا کہ اگر اسے بابر پر فتح ہوئی تو وہ شریعت کے مطابق حکومت کرے گا۔ بابر بقول فضل اللہ نوے ہزار اور بقول حیدر دوغلات چالیس ہزار سپاہ کے ساتھ عبید اللہ کے مقابلہ کے لئے سمرقند سے نکلا۔ کول ملک کے مقام پر دونوں میں مقابلہ ہوا اس جنگ میں بابر کو شکست فاش ہوئی اور وہ بمشکل اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جانیں بچا کر سمرقند سے کابل کی جانب فرار ہوا۔ خدا تعالیٰ نے فضل اللہ کی ”دعا سن لی“ اور اسے ”ملحدوں“ کے چنگل سے نجات ملی[۲۲]۔ عبید اللہ نے ماوراء النہر پر قابض ہوتے ہی فضل اللہ کو بخارا آنے کی دعوت دی اور اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے ان کی خدمت میں ایک ایسی کتاب لکھنے کی درخواست پیش کی جس میں حکومت کے ہر شعبہ کے متعلق شریعت کے احکام موجود ہوں۔ دو سال کی محنت کے بعد ۱۵۱۴ء/۹۲۰ھ میں آپ نے ”سلوک الملوک“ اس کی خدمت میں پیش کی۔ حسن اتفاق سے اس کتاب کا اصل مسودہ بخارا میں ایک روسی مستشرق اے زیڈ والی دو کے ہاتھ[۲۳] لگا اور اس نے

---

[۲۲] ایضاً ص ۱۱ب، ۱۲ الف

[۲۳] میونرسکی، پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸ - ۱۴۹۰ ص ۸

اسے لینن گراڈ کے عجائب گھر موزۂ ایشیاٹک کو دے دیا۔ پروفیسر مینورسکی کی سعی و کاوش سے اس کی مائیکروفلم مجھے مل گئی اور میں نے کیمبرج میں قیام کے دوران اس کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا۔

سلوک الملوک کی تصنیف کے بعد بھی فضل اللہ بے کار نہ بیٹھے بلکہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہے۔ سنہ ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء میں انھوں نے قصیدۂ بردہ کی شرح لکھی اور اصل قصیدہ کا فارسی میں منظوم ترجمہ بھی کر ڈالا۔[۹]

فضل اللہ نے اپنی زندگی کے آخری چھ سال بخارا میں اپنے سرپرست اور قدردان عبید اللہ خان کے دربار میں گزارے اور حسن روملو کی روایت کے مطابق وہیں ۷۷ سال کی عمر میں ۵ جمادی الاول سنہ ۹۲۷ھ مطابق ۱۳ اگست سنہ ۱۵۲۱ء کو وفات پائی۔

فضل اللہ کے آثار

۱۔ بدیع الزمان فی قصۂ حی ابن یقظان۔ فضل اللہ کی اوّلین تالیف ہے جسے انھوں نے ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء سے قبل مکمل کر کے سلطان یعقوب کے نام منسوب کیا۔ بدقسمتی سے اس کتاب کا سراغ دنیا کے کسی بھی کتب خانے میں نہیں ملتا۔

۲۔ مہمان نامہ بخارا کو فضل اللہ کی ذاتی ڈائری کہا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے بخارا، سمرقند، مشہد اور مرو میں منعقد ہونے والے "مباحث دینی"

---

[۹] فضل اللہ۔ شرح قصیدہ بردہ۔ مخطوطہ ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری نمبر ۱۰۵

[۱۰] حسن روملو۔ احسن التواریخ، مطبوعہ بڑودہ سنہ ۱۹۳۱ء ص ۱۷۴

کی تفصیلات دی ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے شیبانی خاں کی قزاقوں کے خلاف مہم کا بھی بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ مولانا اس کا نام سفرنامہ بخارا رکھنا چاہتے تھے لیکن شیبانی خان کے اصرار پر اسے مہمان نامہ بخارا کا نام دیا۔ یہ کتاب تہران سے سنہ ۱۹۶۲ء میں دکتر منوچہر ستودہ کی سعی و ترتیب سے شائع ہو چکی ہے۔

۳۔ کتاب البطال نہج الباطل واہمال کشف العاطل مولانا کی عربی زبان میں ایک اہم تالیف ہے اور جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ کتاب انھوں نے مشہور شیعی عالم علامہ حسن مطہر الحلیؒ کی منہج الحق کے رد میں لکھی تھی۔ جس دن یہ کتاب مکمل ہوئی تھی اسی دن شاہ اسمٰعیل صفوی کے عراق عجم پر قبضہ کی خبر فاضل مصنف کو ملی۔ اس کتاب کا بھی کوئی نسخہ تاحال دستیاب نہیں ہو سکا۔

۴۔ تاریخ عالم آرائے امینی مولانا فضل اللہ کی بہت ہی اہم تالیف ہے جس میں انھوں نے سلطان یعقوب کے عہد کے واقعات قلم بند کئے ہیں۔ اس کتاب کے دو قلمی نسخے ہمارے علم میں ہیں۔

i۔ مخطوطہ نمبر ۴۴۳۱۔ فاتح لائبریری استانبول (۲۲۵ اوراق)

ii۔ مخطوطہ نمبر ۱۰۱۔ ببلیوتھیک نیشنل، پیرس، (۲۰۷ اوراق)

اس کتاب کے چیدہ چیدہ صفحات کا انگریزی ترجمہ لندن سے سنہ ۱۹۵۷ء میں پروفیسر منورسکی آنجہانی نے "پرشیا ان اے۔ڈی ۱۴۷۸-۱۴۹۰" کے نام سے شائع کیا۔

۵۔ سلوک الملوک بلاشبہ مولانا فضل اللہ کی سب سے اہم تصنیف ہے جو انھوں نے عبید اللہ خاں کی استدعا پر لکھی تھی۔ اس کتاب کے پانچ نسخے میرے علم میں ہیں۔

i۔ برٹش میوزیم لندن، مخطوطہ اورنٹیل نمبر ۲۵۳۔

ii۔ موزے ایشیاٹیک لینن گراڈ کا نسخہ مولانا فضل اللہ کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

iii۔ جامعہ نظامیہ حیدر آباد کا نسخہ

iv۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کا نسخہ

v۔ آصفیہ لائبریری حیدر آباد کا نسخہ۔

حال ہی میں ڈاکٹر نظام الدین صاحب مرحوم نے دائرۃ المعارف حیدر آباد کی طرف سے یہ کتاب شائع کر دی ہے لیکن ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری۔ ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر آربری آنجہانی کے توسط سے صرف ایک صفحہ بطور نمونہ مجھے بھیجا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ٹائپ میں بڑی نفاست کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔

۶۔ شرحِ قصیدۂ بُردہ۔ یہ کتاب مولانا نے سنہ ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء میں بخارا میں قلمبند کی تھی اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے مولانا اپنے دور میں قصیدۂ بردہ پہ آخری سند سمجھے جاتے تھے اور دور دراز کے علاقوں سے سینکڑوں کی تعداد میں مشتاقین ان سے قصیدہ کا ورد کرنے کی اجازت لینے آیا کرتے تھے۔ اس کتاب کے تین مخطوطے ہمارے علم میں ہیں۔

i۔ مخطوطہ نمبر ۳۴۳۱، نورعثمانیہ لائبریری، استانبول۔

ii۔ مخطوطہ نمبر ۹۸۹، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ،

iii۔ مخطوطہ نمبر ۱۰۵، ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری، ایڈنبرا، سکاٹ لینڈ،

آخری نسخہ کے ۱۱۳ اوراق ہیں جس سے اس کی ضخامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۷۔ رسالۂ حارثیہ۔ یہ رسالہ مولانا فضل اللہ نے حدیثِ حارث

کی تشریح میں لکھا تھا۔ اس کا کوئی نسخہ ہمارے علم میں نہیں۔ مہمان نامۂ بخارا میں اس کا حوالہ موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء سے قبل تحریر کیا تھا۔

۸۔ رسالہ در حقیقت و انواع حدیث قدسی مولانا فضل اللہ کے ۴ ورق کے اس مختصر سے رسالہ کا واحد نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود ہے جس میں انھوں نے حدیث قدسی کی اقسام ایک عزیز کے استفسار پر ذرا تفصیل سے لکھی تھیں۔ یہ رسالہ ۲۴ر ذی قعدہ ۹۲۲ کو "بقصبہ کرمینہ من سغد سمرقند" میں ورطۂ تحریر میں آیا۔

۹۔ مولانا فضل اللہ نے شیخ علی بن عیسیٰ الاربلی کی مشہور تالیف "کتاب کشف الغمہ" کا ایک خلاصہ تیار کیا اور پھر اس کی شرح لکھی بدقسمتی سے یہ کتاب بھی اب مفقود ہو چکی ہے۔

ان کتب و رسائل کے علاوہ ان کا ایک فارسی اور ایک ترکی قصیدہ منشآت السلاطین میں محفوظ ہے، ان قصائد میں انھوں نے سلطان سلیم عثمانی سے استدعا کی ہے کہ جس طرح سکندر نے ایران پر حملہ کر کے دارا کو شکست دی تھی اسی طرح آپ بھی ایران پر حملہ کر کے شاہ اسمٰعیل صفوی کو شکست دیں۔ مولانا کی یہ آرزو ان کی زندگی ہی میں پوری ہو گئی اور سلطان سلیم نے چالدران کی جنگ میں شاہ اسمٰعیل کو شکست فاش دے کر اس کے پایۂ تخت تبریز پر قبضہ کر لیا۔

مولانا کی کتابوں کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مندرجہ بالا کتب کے علاوہ نو اور کتابیں بھی تحریر کی تھیں، جو زمانہ کی دست برد سے ہم تک نہیں پہنچ پائیں۔

۱۔ مناقب پیر جمال اردستانیؒ
۲۔ شرح صحیح المسلم
۳۔ شرح وصایائے خواجہ عبد الخالق غجدوانیؒ
۴۔ حاشیہ بر حواشی شرح جدید
۵۔ حاشیہ بر تفسیرِ کشاف
۶۔ رسالہ مقاصد
۷۔ حاشیہ بر محالات
۸۔ حلِ تجرید
۹۔ حاشیہ بر کتاب شرح مواقف

رسالہ در حقیقت و انواع حدیث قدسی

(یہ چار ورق کا مختصر سا رسالہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے مجموعہ سبحان اللہ (۲۹/۴۳) میں محفوظ ہے اور جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے یہ واحد نسخہ ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ مولانا کے حالات کے ساتھ اسے بھی شائع کر دیا جائے تاکہ یہ محفوظ ہو جائے۔ رسالہ کا رسم الخط نستعلیق ہے حتیٰ کہ عربی عبارات بھی نستعلیق میں ہی لکھی ہوئی ہیں رسالہ قدرے کرم خوردہ ہے اس لئے پڑھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔)

الحمد للہ الذی نزلِ احسن الحدیث کتاباً فسمّی القدسیِّ خطاباً

والصلوٰة علیٰ سیدنا محمد الراوی عن ربّه حکمة وصواباً وعلیٰ آله واصحابه ما انشأ الریاح سحاباً، و بعد نموده می شود که یکی از اصحاب که در زمره سادات رتبه ارجمندان داشت و از ارباب سعادات نزد ما مرتبه فرزندان داشت[لہ] التماس نموده که حقیقت حدیث قدسی جهت او بیان کرده شود و بعضی از آن با ترجمه در طی بیان حقیقت او آورده شود به حسب التماس آن فرزند اعز ارجمند این ورقه مکتوب گشت۔ امید که فوائد آن مسلمانان را شامل گردد و ما را ثواب تبلیغ علم حاصل گردد ان شاء الله تعالیٰ والتوفیق منه فی کل باب۔

بدان ایدک الله تعالیٰ که حدیث قدسی حدیثی است که حضرت پیامبر صلی الله علیه وسلم آن را روایت فرموده باشد از پروردگار خود بصیغه که دلالت کند بر آنکه آن فرموده حق تعالیٰ است و حرف متعلق بلفظ آن نباشد و مراد از عدم تعلق حرف بلفظ آنست که لفظ آن را جنب و حائض تواند خواند و بی طهارت مساس آن توان کرد و بدین قید ممتاز می گردد از قرآن و فرق میان او و قرآن از چند وجه است، اول آنکه حدیث قدسی مروی پیغامبر است از حضرت حق تعالیٰ و قرآن منزل بوحی است۔ دوم آنکه قرآن لا بد است که منزل بآنحضرت صلی الله علیه وسلم بواسطهٔ جبریل باشد و در حدیث قدسی این لازم نیست۔ سیوم آنکه لفظ حدیث قدسی لازم نیست که بر حضرت پیغامبر صلی الله علیه وسلم از جانب حق تعالیٰ وارد شده باشد بلکه معنی آن ملقی به آنحضرت صلی الله علیه وسلم شده و لفظ می تواند بود که

[لہ] مراد باین سیدی که رتبه ارجمندان دارد در سلطان محمود مشهور بهر که سید غیاث است

از ان پیغامبر باشد صلی الله علیه وسلم، و چون این مقدمه معلوم شد باید دانست که حدیث قدسی هر چند نوع است۔ نوع اوّل آنکه در شب معراج بعد از قطع سموات و عبور از سدرة المنتهیٰ چون بشرف لقای حضرت جل و علا مشرف گشت حق تعالی با آنحضرت صلی الله علیه وسلّم مکالمه فرمود و آن کلام را آنحضرت صلی الله علیه وسلّم با امت خود روایت کرد و در عدد آن اختلاف کرده اند بعضی گویند که او سه قسم بود، یک قسم آنکه حضرت حق تعالی امر فرمود که آنرا به بندگان برساند، قسم دوم آنکه امر فرمود که آنرا پوشیده دارد از بندگان زیرا که منفعت آن خاصهٔ آنحضرت بود صلی الله علیه وسلم و دیگر امتان آنرا نمی فهمیدند پس از ایشان پوشیده بایست داشتن، قسم سیوم آنکه آنحضرت صلی الله علیه وسلم مرخص بود که اگر خواهد برساند و اگر نخواهد نرساند بعضی گویند سی هزار حدیث بود و از آنجمله کتابیست که آنرا احمدیات گویند و در آنجا بسیاری از احادیث است یا احمد محبّتی محبة الفقرأ فقرب مجلسهم منک ادنک یعنی ای احمد دوستی من دوستی فقرا است پس نزدیک گردان مجلس ایشان را که بخود که نزدیک کردم من تو را اما علمای حدیث را در صحت احادیث احمدیات سخن است. و تعیین عدد آن احادیث در صحیح وارد نشده و از جمله احادیث قدسیه که در صحیح وارد شده که در شب معراج در مکالمهٔ حق با آنحضرت بوده این حدیث است، هی خمسٌ وَهی خمسون لا یُبدّل القول لدیّ یعنی این نماز که بر بندگان فرض گردانیدم پنج نماز است و ثواب پنجاه نماز دارد و تبدیل کرده نمی شود قول نزد من، یعنی سخن من و امر من تبدیل نمی یابد۔ و نیز این حدیث دیگر است، امضیت فریضتی و خففت عن عبادی یعنی فریضهٔ خود را

امضاء کردم و از بندگان خود تخفیف نمودم، و این هر دو حدیث در شب معراج وارد شده بعد از آنکه نماز پنجاه وقت مقرر شده بود باشارهٔ موسیٰ درخواست آن حضرت علیہما الصلوٰة والسلام از پنجاه به پنج مقرر شده، حق تعالیٰ این دو حدیث به آنحضرت فرموده و نیز در احادیث قدسیه شب معراج وارد شده۔ یا محمد ان هن خمس صلوٰة کل یوم ولیلة لکل عشر فذلك خمسون صلوٰة من هم بحسنة فلم یعملها کتبت له حسنة فان عملها کتبت له عشرا ومن هم بسیئة فلم یعملها لم یکتب له شیئ وان عملها کتبت له سیئة واحدة۔ یعنی ای محمد این نمازهای فرض کرده شود بر تو پنج نماز است در شبانه روزی مر هر نمازی را ثواب ده نماز است پس پنجاه نماز باشد، هر که قصد نیکو کند و آنرا بعمل نیاورد از برای او ثواب یک حسنه نویسند، پس اگر بعمل در آورد او را ثواب ده حسنه نویسند، و هر که قصد کار بدی کند و بعمل نیاورد و هیچ چیز بروی ننویسند۔ و اگر بعمل آورد از برای او یک گناه نویسند۔ نوع دوم از حدیث قدسی آنست که معنیٔ آن حق تعالیٰ در دل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم می افگند و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعبارت خود آنرا بیان می فرماید، و از صحاح آن احادیث حدیث است قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما یرویه عن ربه اعددت لعبادی الصالحین[1] ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ یعنی مهیا گردانیده ام از برای بندگان صالح خود آن چیزی که ندید چشمی و نه گوشے شنید و نگذشت بر دل آدمی مراد آنکه ثواب بندگان

---

[1] مراد از صالحان عارفان اسرار باطن و مراد از ما لا عین رازهای درونی ایشان است که عنایت الہی باعطا یش خاص گردانده۔

صالحان بسیار عظیم است که مثل آن کس ندیده و نشنیده و در دل کسی نگذشته و دیگر این حدیث است که در صحیح مسلم از ابوذر روایت کرده قال الله تعالی یا عبادی کلکم ضال الا من هدیته فاستهدونی اهدکم یا عبادی کلکم جائع الا من اطعمته فاستطعمونی اطعمکم یا عبادی کلکم عار الا من کسوته فاستکسونی اکسکم یا عبادی انکم تخطئون باللیل والنهار وانا اغفر الذنوب جمیعا فاستغفرونی اغفر لکم یا عبادی انکم لن تبلغوا ضری فتضرونی ولن تبلغوا نفعی فتنفعونی یا عبادی لو ان اولکم واخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی اتقی قلب رجل واحد منکم ما زاد ذلک فی ملکی شیئا یا عبادی لو ان اولکم واخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی افجر قلب رجل واحد منکم ما نقص ذلک من ملکی شیئا یا عبادی لو ان اولکم واخرکم وانسکم وجنکم قاموا فی صعید واحد فسألونی فاعطیت کل انسان مسألته ما نقص ذلک مما عندی الا کما ینقص المخیط اذا ادخل البحر یا عبادی انما هی اعمالکم احصیها لکم ثم اوفیکم ایاها فمن وجد خیرا فلیحمد الله ومن وجد غیر ذلک فلا یلومن الا نفسه صدق یا رسول الله -

ترجمه حدیث قدسی - ای بندگان من، همه شما گمراهید مگر آن کسی که من راهنمایم اورا، پس طلب راه راست کنید از من که من راه راست نمایم شمارا، ای بندگان من، همه شما گرسنه اید مگر آنکسی که من طعام دهم اورا، پس طلب طعام کنید از من که طعام نمایم شمارا، ای بندگان من، همه شما خطائی کنید در شب و روز و من می آمرزم گناهان را همه، پس طلب آمرزش

کنید از من که بیامرزم شما را ، ای بندگان من شما نمی رسید به رسانیدن گزند بمن پس تا گزند رسانید بمن و نمی رسید به رسانیدن نفع بمن تا نفع رسانید مرا ، ای بندگان من اگر آنکه اوّل شما و انس شما و جنّ شما باشند بر دل متقی ترین مردی از شما زیادت نمی گرداند در ملک من چیزی را ، ای بندگان من اگر آنکه اوّل شما و آخر شما و انس شما و جن شما باشند بر دل فاجر ترین مردی از شما کم نمی گرداند در ملک من چیزی را ، ای بندگان من اگر اوّل شما و آخر شما و انس شما و جن شما بایستند در یک زمین هموار پس بخواهند هر یکی از من آنچه مطلوب او باشد پس من بدهم هر کس را آنچه خواسته کم نگرداند از ملک من چیزی را الّا آن قدر که کم میگرداند سوزن هرگاه که در دریا فرو برند ، ای بندگان من نیست این عملهای شما که من آن را شمارم و ضبط میکنم پس از آن جزای آن را تمام بشما می رسانم ، پس آنکسی که می یابد چیزی را باید که ستایش کند پروردگار را و آنکسی نیابد غیر آن پس باید که ملامت نکند مگر نفس خود را ، تمام شد" و امثال این نوع در احادیث قدسیه بسیار است ، نوع سیوم آنست که حضرت پیغامبر صلی اللہ علیه وسلم از جبرئیل علیه السلام روایت می کند و او از حضرت حق تعالیٰ جل و علا روایت میکند و از آنجمله است حدیث مسلسل بروایت اہل بیت که در آنجا امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنه فرمود که حضرت پیغامبر صلی اللہ علیه وسلم فرمود که حضرت جبرئیل علیه السلام فرمود که حضرت حق تعالیٰ فرمود کلمة لا اله الا اللہ حصنی فمن قالها دخل فی حصنی ومن دخل فی حصنی امن من عذابی — یعنی کلمه لا اله الا اللہ حصار من است پس آنکسی که گفت آن کلمه را در آمد در حصار من و هرکس که در آمد در حصار من امن

گشت از عذاب من ، و امثال او در احادیث قدسیه بسیار است ، نوع
چهارم از احادیث قدسیه آنست که آنحضرت صلی الله علیه وسلم از معنی قرآن
استنباط فرموده باشد و در آخر صورت آیت را باستشهاد آورده باشد و امثله
او در احادیث بسیار است . نوع پنجم از احادیث قدسیه آنست که آنحضرت
صلی الله علیه وسلم از اوامر و احکام الهی نسبت با امم سالفه یا از کتب استنباط
فرموده باشد یا از مجاری اقوال سابقان در اجرای حکم مقتضای الهی در شان
ایشان فرا گرفته باشد و این نوع را هم امثله بسیار است . نوع ششم آنکه
آنحضرت صلی الله علیه وسلم حضرت حق تعالی را در واقعه دیده باشد در رویای
صالحه که یک جزو از اجزای نبوت است حضرت حق تعالی با آنحضرت صلی الله
صلی الله علیه وسلم خطاب فرموده باشد و آنحضرت صلی الله علیه وسلم
حکایت آن خطاب بامت فرموده باشد و از آنجمله است حدیثی که در
باب کفارت وارد شده و از کتب صحاح موجود است ، این شش نوع است
حدیث قدسی که امثله و شواهد آن در احادیث بسیار واقع شده و اگر درین
محل بسط نموده مجلدی کبیر تالیف باید کرد ولی حسب ضیق الوقت این چند
ورق مکتوب شد و بعضی امثله آورده گشت تا اطلاع بر انواع آن میسّر
گردد ، والتوفیق من الله الاحد ، تمت الرسالة بیمن مؤلفها
العبد فضل الله بن روزبهان المشتهر بخواجه مولانا اصفهانی
بلغه الله اقصی الامانی فی الرابع والعشرین من شهر
ذی قعده سنه اثنین وعشرین وتسعمأیه وقد کتبت
فی بعض لیلة من اللیالی والحمد لله علی نعمته الکامل
ولطفه الشامل وفضله الحاصل بقبضته کرمبنه من

اعمال سعد سمرقند والحمد لله الواحد الاحد و والختم بالصلوٰة والسلام علی سیدنا ونبینا محمد صلی الله وعلیه وسلم۔

کاتب محمد باقر بن عبد الله الیمنی، المشتهر بامیر عرب، صفر سنه ثمان وستین وستمایه..

مبلغ الرجال

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خواجہ عبیداللہ المعروف بخواجہ کلاںؒ بن خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کی ایک نادر فارسی تصنیف مبلغ الرجال کا مخطوطہ موجود ہے، جس کا فہرست نگار نے یونیورسٹی کلکشن میں نمبر ۱۹۱ کے تحت اندراج کیا ہے۔ یہ مخطوطہ ۳۰ اوراق پر مشتمل اور کافی حد تک کرم خوردہ ہے۔ اس رسالہ کا ایک اور نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ جس کا فہرست نگار نے دہلی کلکشن میں نمبر ۱۱۲ کے تحت اندراج کیا ہے[1]۔ اس وقت تک اس رسالے کے یہی دو نسخے منظر عام پر آئے ہیں۔

مبلغ الرجال کے سرورق پر یہ عبارت موجود ہے: "رسالہ مبلغ الرجال من مصنفات حضرت خواجہ کلاں بنؒ حضرت خواجہ باقی باللہ۔ ۱۰ / جمادی الاولیٰ یوم الثلثا" ۱۰۲۶ ہجری صلعم[2]" اسی طرح رسالہ کے اختتام پر یہ عبارت درج

---

[1] مائیکروفلم عندی

[2] مبلغ الرجال، نسخہ علی گڑھ، سرورق۔

ہے" وقد فرغت من تسوید هذه العجالہ ست وستین ۱۰۶۶ بعد الف"[53] ان دونوں تحریروں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں اس رسالہ کا سالِ تالیف اور سالِ کتابت ایک ہی ہے۔ اگر مصنف کے نام سے پہلے "حضرت" تحریر نہ ہوتا تو ہم یہ باور کر لیتے کہ یہ رسالہ فاضل مصنف ہی کا تحریر کردہ ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ کاتب نے اسے سالِ تالیف ہی میں اصل نسخے سے نقل کیا ہے۔

مولانا عبد الحئیؒ نے نزهة الخواطر میں خواجہ کلاںؒ کی تصانیف کا ذکر کیا ہے لیکن ان میں مبلغ الرجال شامل نہیں[54] اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس رسالہ کے مخطوطات نایاب ہیں اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی دوسری کتاب میں اس رسالہ کا نام دیکھنے میں نہیں آیا، اس لئے مولانا عبد الحئیؒ اس رسالہ سے بے خبر تھے۔ اس رسالہ کا نام مبلغ الرجال عبارت کے درمیان میں بھی موجود ہے اس لئے اس میں شک نہیں کہ یہ رسالہ اسی نام سے موسوم ہے[55]

فاضل مصنف اس رسالہ کی ابتدا یوں کرتے ہیں۔ الحمد لله علیٰ مامنّ علینا بالارشاد إلیٰ سواء السبیل والصلوٰة والسلام علیٰ سیدنا محمد اٰل العبد۔ گوید بندہ سرافگندہ شرمندہ از کردار تباہ سراپا گناہ خانہ زاد خواجہ آفاق سبطِ آل نبی مؤید الملة والدین ابوالوقت خواجہ محمد الباقی قدس سرہٗ، احقر عبید الله سامحه الله سبحانہ[56]

---

[53] ایضاً۔ ورق آخر۔ [54] نزهة الخواطر، جلد پنجم، مطبوعہ حیدرآباد، ۱۹۵۵ء، ص ۲۶۹

[55] "این رسالہ را مبلغ الرجال نام کردہ شد"۔ ورق ۳ الف [56] مبلغ الرجال، ورق ۱ ب

اس رسالہ میں اکثر جگہ ایسی ہی مرصع عبارات موجود ہیں۔ مثلاً محمود دہستانی کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ کلاں رقمطراز ہیں:۔

> "از املاک ولایت خوزستان در عنفوان سن شعور طریق طلب معرفت و کسب سعادت برگزیدہ دل از وطن مالوف برید، واز ناز ونعم دست افشاندہ در ویرانہای آن سرزمین گوشہ انزوا گزیدہ بود و آنجا بطاعت وعبادت وذکر ومراقبہ مشغول بودہ"[ث]

اس کتاب کی تالیف کے دوران فاضل مصنف نے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا ہے۔

مرأۃ الجنان، کتاب الانساب، مصباح الھدایہ، اصطلاحات، مفتاح الاسرار، احیاء العلوم، کتاب التنزیل، مشکوۃ الانوار، تعرفۃ العقائد اور شرح تعرف۔

ان کتابوں سے استفادہ کے علاوہ فاضل مصنف نے مندرجہ ذیل بزرگوں کے اقوال بھی اس رسالہ میں نقل کئے ہیں۔

ابوعلی دقاقؒ، شہاب الدین تورپشتی، مولانا رومیؒ، احمد غزالیؒ، محمد غزالیؒ عین القضاۃ ہمدانیؒ، شیخ عبداللہ یافعیؒ، ابن جوزیؒ، ابن الاثیر الجزریؒ، ابوسعید ابوالخیرؒ، میر سید شریف، شیخ عبدالرزاق کاشی، فریدالدین عطارؒ، حسین بن منصور حلاج، شیخ شہاب الدین مقتول، شیخ ابراہیم کانبوریؒ، شیخ ابومحمد حریری، عزیزالدین محمد نسفیؒ، ملا حسین کاشفیؒ، خواجہ غیاث الدین مقصود کازرونی،

[ث] ایضاً - ورق ۱۳۱ ب

حضرت علیؓ، ابوالحسن نوریؒ، اوحدالدین کرمانیؒ، سہل بن عبداللہ تستریؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، شبلیؒ، خواجہ باقی باللہؒ، ابوبکر وراقؒ، ابوالحسن خرقانیؒ، فخرالدین عراقیؒ، شیخ عبدالحق محدثؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ محی الدین اکبر ابن عربیؒ، ابوبکر کلاباذیؒ، ابوالعباس ابن عطا ارمی اور محمود پیچوانی۔

اِس رسالہ میں مندرجہ ذیل اشخاص کا ذکر کسی نہ کسی سلسلہ میں آیا ہے۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، محمود غزنوی، شریف آملی، امیر تیمور، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان، اسمٰعیل صفوی، شیخ مبارک، لاڈو فیضی، ابوالفضل، ابوالخیر، ابوالبرکات، ابوالمکارم، ابراہیم لودھی، اسمٰعیل بن جعفر صادق، اویس قرنیؒ، حسن بصریؒ، عبداللہ بن المقنع، ہارون الرشید، داؤدؑ، جلال الدین تھانیسری، شاہ قاسم الوائی، میاں شیخ میر، شیخ عبدالجلیل، نوشیرواں، مزدک، ابوالعباس السفاح، ابوجعفر منصور، خلیفہ ہادی، مولانا زاہد بلخی، شیخ حسین خوارزمی، خلیفہ المتوکل، المعتصم، بابک رومی، یعقوب بن المعقیل، عبداللہ بن سباء، شیخ محمد بن حسن ملتانی، سیف الدین بن شیخ سعداللہ بخاری، شیخ حمید افغان، سید بدیع الدین صفوی، سلطان سنجر، ابراہیم زردشتی اور گشتاسپ بن لہراسپ۔

فاضل مصنف نے چونکہ طریقت کے اعلیٰ مقامات حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں رہ کر طے کئے تھے، اس لئے جہاں کہیں بھی حضرت کا ذکر آیا ہے مصنف نے ان کا ذکر بڑے عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک جگہ آپ ان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

یکے از کبار صوفیائے عظمیٰ بدرالملت والدین ابوالبرکات شیخ احمد بن شیخ عبدالاحد السہرندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہٗ[۳۵]

---

[۳۵] ایضاً۔ ورق ۴ الف

ایک دوسرے موقع پر ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

شیخ الشیوخ العصر شیخ بدر الدین ابو البرکات احمد السہرندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہٗ۔[9]

اس رسالہ میں ایک جگہ حضرت کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

شیخ الشیوخ العصر امام الراسخین و قدوۃ المتمکنین بدر الملت والدین ابو البرکات شیخ احمد السرہندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہٗ۔[10]

آمدم بر سر مطلب، اس رسالہ میں چار وصل اور ایک فصل موجود ہے جیسا کہ فاضل مصنف فرماتے ہیں: "مطلب این رسالہ در چہار وصل (بواؤ) و یک فصل (بفاء) تحریر می یابد" ان وصول کے مطالب درج ذیل ہیں۔

وصل اوّل - در بیان مذہب حکماء

وصل دوم - در بیان مذہب متکلمین و جمہور قدماء صوفیہ

وصل سوم - در بیان مذہب اتباع شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہٗ، حکماء اشراقیین و لتصرف کہ شیخ العصر بدر الدین ابو البرکات احمد السرہندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہٗ درین مسئلہ نمودہ اند۔

وصل چہارم :۔ در بیان فضل و رجحان مقام انبیاء علیہم السلام و ہر کہ بر مسلک ایشان علیہم السلام رسوخ ورزد۔

فصل بفاء - در مذہب ملاحدہ حفظہم اللہ سبحانہٗ۔

اب ہم ان میں سے ہر موضوع پہ الگ الگ بحث کریں گے۔

---

[9] ایضاً، ورق ۴ الف

[10] ایضاً، ورق ۲۲ ب

وصل اوّل :۔ فلاسفہ کا کہنا ہے :۔

> واجب الوجود موجب نداشت عالم از ذات او صادر شدہ چنانچہ شعاع از قرص، و وجود معلول از علّت، پس تا قرص آفتاب بود شعاع آفتاب، وکذا الحکم فی العلة والمعلول، و می گویند کہ اوّل چیزے از باری تعالیٰ صادر شد جوہری بود، نام آن جوہر عقل است اوّل، و این بر اصل اہلِ حکمت است کہ انہ لایصدر من الواحد الا الواحد، پس از باری تعالیٰ کہ احد حقیقی است، احد حقیقی صادر شد و آن عقل اوّل است[11]

فلاسفہ کا یہ خیال ہے کہ اسی عقل سے روح و نور، جبرئیلؑ، میکائیلؑ عزرائیلؑ اور اسرافیلؑ پیدا ہوئے، اور اسی سے لوح و قلم، بیت اللہ، بیت العتیق، و بیت الاوّل اور مسجد اقصیٰ وجود میں آئے۔ پھر اسی عقل سے آدمؑ، ملک مقرب اور عرشِ عظیم ظہور میں آئے، اور جو کچھ بھی معرضِ وجود میں آیا ہے، یہ "جملہ اسامی این عقل اند"[12]

اس کے علاوہ فلاسفہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ یا تو جوہر ہے یا عرض[13] فلاسفہ کے ان اقوال کی تائید میں آپ نے احمد غزالیؒ، ابودقاق، شہاب الدین تورپشتی، مولانا رومیؒ، محمد غزالیؒ، عبدالرحمن الجوزیؒ، عبداللہ یافعیؒ، ابن الاثیر الجزریؒ اور عین القضاۃ ہمدانیؒ کے اقوال نقل

---

[11] ایضاً، ورق ۴ ب [12] ایضاً، ورق ۵ الف

[13] ایضاً، ورق ۵ ب

لے ہیں۔

وحدت دوم: خواجہ ولیؒ قنطاری یہی کہ بعد متکلمین کہتے ہیں کہ "اوّل چیزے کہ از دریائے عدم بساحل وجود آمد جوہرے بود آں جوہرے بشگافت و دو شاخ شد، شاخے از آن مبداء ارواح است و شاخے مبداء اجسام و مبداء عالم اشباح و در زبان شرع او خوانده شده و حقیقت محمدی گفتہ حتی شد دیو منوت"[14]۔

متکلمین میں ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے جس کا یہ خیال ہے کہ سب سے پہلے خدا نے جوہر خاک پیدا کیا اور اس کے واسطے سے دوسری چیزیں پیدا کیں[15]۔ اس نظریے کی تائید میں بھی خواجہ صاحب کو عین القضاۃ ہمدانی اور احمد غزالی کے اقوال مل گئے ہیں۔

وصل سوم: اہل وحدت کا یہ خیال ہے کہ وجود ایک ہے دو نہیں ہو سکتا، اور اس وجود سے ان کی مراد وجود باری تعالیٰ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ باری تعالیٰ کا وجود کوئی جزو یا حصہ رکھتا ہو۔ اہل وحدت کہتے ہیں کہ اس کا ایک وجود ظاہری ہے اور دوسرا باطنی۔ اور یہ باطنی وجود نور ہے اور یہی نور جان عالم ہے اور اسی نور سے یہ عالم مالا مال ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ "ظاہر این وجود مظاہر صفات این نور اند۔ ہر اسمے و فعلے و صفتے کہ در عالم است جملہ آسامی و افعال از پرتو نور وجود است"[16]

---

[14] ایضاً، ورق ۲ الف [15] ایضاً، ورق ۶ ب

[16] ایضاً، ورق ۱۳ الف۔

اہل وحدت یہ بھی کہتے ہیں کہ "حقیقت امواج کثرہ بحر جز بحر نیست"۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کلمات وحروف کی حقیقت اسی ذات کی تجلیات ہیں۔ اہل وحدت کہتے ہیں کہ "ہمہ صورت ہای علمی حق اندکہ حق تعالیٰ خود را با این صورتہا ظاہر گردانیدہ است"[117] اس نظریہ کی تائید میں خواجہ کلاںؒ نے صوفیۂ موحدہ میں سے میر سید شریف، امام غزالیؒ، شیخ شہاب الدین مقتول، ملا حسین کاشفی، خواجہ غیاث الدین مقصود کازرونی، حسین بن منصور حلاج، شیخ عبدالرزاق کاشی، فریدالدین عطارؒ، ابوالحسن نوریؒ، اوحدالدین کرمانیؒ، شیخ ابراہیم کانپوریؒ، سہل بن عبداللہ تستریؒ، شیخ ابو محمد حریریؒ اور عزیزالدین محمد نسفیؒ کے حوالے دیئے ہیں۔ مزید برآں آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی ایک قول نقل کیا ہے۔

یہ سب لکھنے کے بعد خواجہ صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ "علماء شرع شریف را بر بعضی از کلمات این طائفہ اعنی صوفیہ موحدہ اعتراضے است"[118] اس کے بعد آپ نے خود ہی صوفیہ موحدہ پر اعتراضات کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا کلام خلافِ شریعت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اس جھگڑے میں نہ پڑتا لیکن حضورؐ کی ایک حدیث یاد آ گئی ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں :۔

الساکت عن الحق شیطان اخرس

لہٰذا میں ان کے اقوال کے جوابات دینے پر مجبور ہوں۔[119]

---

[117] ایضاً [118] ایضاً، ورق ۲۰ الف

[119] ایضاً۔

خواجہ کلاںؒ شیخ محی الدین اکبر ابن عربیؒ کا نظریۂ وحدت الوجود بیان کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ اس نظریہ پر حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے تصرف کیا ہے۔ حضرت کا یہ فرمان ہے کہ:

> عبودیت مقام عدم ذاتی و احتیاج است کہ عین حقیقت امکانیہ است، پس ہر کہ خود را بہ مقام مذکور نگاہ دارد از معارف حضرت الٰہی نصیبہ بہتر یابد۔ و این مقام مطابق قدم نبوّت است۔ پس اہتمام در اکثار عبادت باوجود حصول کمالِ حقیقی سبب ازدیاد مشخصات کمال وجودی شخصی آید پس التزام بدان لازم باشد۔ بالجملہ احکام وجود شخصی را با کمال توحید جمع داشتن قدم انبیاء است[20]۔

اسی وجہ سے حضرت یہ فرمایا کرتے تھے کہ منتہیوں کا قولِ و فعل شریعت سے اقرب ہوگا۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت مجدّد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ جس قدر عارف کا پایۂ عبودیت بڑھے گا، اسی قدر کنگرۂ عرفان رفیع تر ہوگا۔ آپ کا یہ بھی قول ہے کہ جنھیں مقامِ عبدیت پر استقامت ہوگی انھیں کو معبود کی تجلیوں سے بہرہ ملے گا۔ اور یاد رہے کہ یہی مقام انبیاء علیہم السلام کا تھا اور حضور سرورِ کائناتؐ مقام عبودیت میں ان سب سے آگے تھے[21]۔

فصل چہارم: ۔ خواجۂ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد توحید کے موضوع پر گفتگو ہونے لگی اور توحید فعلی

---

[20] ایضاً، ورق ۲۴۳ الف

[21] ایضاً۔

اور توحید صفاتی پر لوگوں کی زبانیں کھلنے لگیں۔ اسی طرح جب توکل اور تفویض کے موضوع زیر بحث آئے تو حضرت اویس قرنیؓ اور حضرت حسن بصریؒ سے لے کر سید الطائفہ جنید بغدادیؒ تک رائے زنی کرنے لگے۔ پھر کچھ اور زمانہ گذرا تو توحید حالی اور توحید حق پر مناظرے ہونے لگے اور محبت وانس اور ہیبت و وصلت پر بھی گفتگو ہونے لگی۔ انہی ایام میں ابن العربیؒ بھی میدان میں نکل آئے اور وحدۃ الوجود کے موضوع پر وعظ کہنے لگے۔ اس کے بعد صحو و تمکین صوفیہ کا تکیہ بنے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ صحو و تمکین کمال تنزل درجات ہے اور صوفیہ اسے "قصور استعداد بشرف تجلیات ذاتیہ" کے نام سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔[۲۲]

خواجہ کلاںؒ فرماتے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ "نہایات الصدیقین اول احوال الانبیاء" اور اس کی تشریح وہ یوں کیا کرتے تھے کہ اگر احوال الانبیاء کو ایک پانی سے بھری ہوئی مشک سے تشبیہ دی جائے تو "نہایات الصدیقین" کی مثال اس طراوت جیسی ہوگی جو مشک کی سطح پر آجاتی ہے۔[۲۳] (یعنی قطرۂ آب بھی نہیں) غالباً حضرت بایزیدؒ کے اسی قول کو پیش نظر رکھ کر ابو العباس ابن عطا ارمیؒ نے یہ کہا تھا۔

ادنیٰ منازل المرسلین اعلیٰ مراتب الانبیاء
ادنیٰ مراتب الانبیاء اعلیٰ مراتب الصدیقین

---

[۲۲] ایضاً، ورق ۲۳ ب
[۲۳] ایضاً، ورق ۲۴ ب

ادنیٰ مراتب الصدیقین اعلیٰ مراتب الشہدا۔
ادنیٰ مراتب الشہدا اعلیٰ مراتب الصالحین۔
ادنیٰ مراتب الصالحین اعلیٰ مراتب المومنین[24]۔

خواجہ کلاںؒ جناب ابوبکر کلاباذیؒ کی شرح تعرف کے حوالے سے یہ نقل فرماتے ہیں کہ اس پہ اولیاء اللہ کا اجماع ہے کہ خواہ کوئی کتنا ہی بلند پایہ اور قوی مایہ کیوں نہ ہو زمرہ انبیاء کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ ایک دوسرے موقع پہ شیخ شہاب الدین مسعود نائب خواہر زادہ سلطان فیروز تغلق کے رسالہ تنزیہ العقائد کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں کہ یہ

"نبوۃ صفتے است مخصوص کہ یافتہ نشود مگر در انبیاء ہمچو نطق در انسان۔ و ولایت صفتے است کہ یافتہ می شود در انبیاء و اولیاء مثل حیوۃ کہ شامل است مر انسان و حیوان را[25]۔"

خواجہ صاحبؒ اس جگہ مفتاح الاسرار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ سماء الدین ابراہیم کانپوریؒ کا بھی یہی قول ہے[26]۔

فصل در بیان مذہب ملاحدہ کا:۔

ملاحدہ وہ لوگ ہیں جو "عالم را موجود یا اعتبار می دانند و ترتیب ثواب و عقاب بر عمل و کردار اعتقاد ندارند"[27]۔ اس گروہ خبیثہ میں عضریہ، کولیہ، سوفسطائیہ اور وجودیہ شامل ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ ذہن میں ہوگا وہ آگے آئے گا۔ اور اس کے آگے میں قدرت کو کوئی دخل نہیں

---

[24] ایضاً   [25] ایضاً، ورق ۲۵ الف
[26] ایضاً   [27] ایضاً،

بلکہ یہ عمل تاثیرِ کواکب و عناصر کے تحت ہوگا۔ یہ لوگ مبداؤ معاد کے مسائل کو دل لگی سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص مرتا ہے وہ گھاس کی طرح ضائع ہو جاتا ہے[۲۸]

یہ لوگ قرآنِ پاک کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھتے ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ احکامِ شرع اہلِ رائے کے بنائے ہیں۔ ملاحدہ نماز کا مذاق اڑاتے ہیں اور جب کسی کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ خدا کو آسمان پہ ماننا اور سر زمین پہ رکھنا بھی بھلا کوئی دانائی کا کام ہے۔ جب یہ لوگ حجاج کو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اُنھوں نے کیا گم کر دیا ہے جس کی تلاش میں یہ ادھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ قربانی کے جانوروں کو دیکھ کر یہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ان بے گناہوں کو کیوں مارتے ہو۔ ماہِ رمضان کا نام اُنھوں نے ماہ گرسنگی و تشنگی رکھا ہوا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جو قطرہ آب انسان کی خلقت کا سبب ہے۔ اِس کے باہر نکلنے سے غسل کیونکر واجب ہوتا ہے؟ حالانکہ اسی راہ سے پیشاب، جو کہیں زیادہ گندہ ہے، نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ لوگ ماں بہن کی حرمت کے قائل نہیں ہیں، یہ گروہ نقلیات کا منکر اور عقلیات کا داعی ہے اور ہر اسلامی شعار کا مذاق اُڑانا اس کا بہترین شغل ہے[۲۹]

ملاحدہ کا طریقہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک ندیم ابراہیم

---

[۲۸] ایضاً۔ [۲۹] ایضاً، ورق، ۲۵ب،

زردشتی سے شروع ہوا۔ اس طائفہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ابراہیم زردشتی کے بدن پہ برص نمودار ہوئی تو بنی اسرائیل نے اُسے جلاوطن کر دیا اور وہ ایران چلا آیا، جہاں گشتاسپ بن لہراسپ نے اُسے اپنے ہاں پناہ دی۔ ایران میں قیام نے دوران اس نے عوام کو "آئین زندقہ و اباحت" سے روشناس کرایا۔ اکاسرۂ ایران کی سرپرستی میں اس طریقہ کی ایران میں خوب ترویج ہوئی۔ جب یہودیوں کی ایران میں آمد و رفت شروع ہوئی تو وہ بھی "آئین اباحت" سے روشناس ہوئے رومیوں نے بھی اس سرزمین سے یہ فیض پایا اور حکمائے اشراقی اور حکمائے مشائین بھی ایران میں رہتے ہوئے "آئین زندقہ و اباحت" سے اثر پذیر ہوئے۔

جب نوشیرواں تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق زنادقہ اور اباحیہ کا قلع قمع کیا۔ اسی کے عہد معدلت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایران پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ خلافت میں:

> "عبداللہ ابن سبا در لباس تشیع مجدد آن مذہب ناروا گشت و گروہا گروہ مردم از اہل کوفہ و بصرہ و مصر و یمن بنا دلستگی گفتار او را پذیرفتند و بظاہر خویشتن را شیعہ آل محمد گردانیدہ۔ بباطن در فساد دین متین اسلام کوشیدند و فتنہ ہا نمایند[۳۵]

---

۳۵ ایضاً۔

از نفوس طیبہ در باد خزاں فتنہ و فساد نابود شدند۔[۳۱]

حضرت علیؓ نے ان میں سے بہتوں کو جہنم رسید کیا۔

ابوالعباس السفاح اور ابوجعفر منصور کے عہد میں مزدک نامی ایک شخص نے دوبارہ یہی فتنہ کھڑا کیا اور مہدی و ہادی کے زمانے میں کثرت کے ساتھ لوگ گمراہ ہوئے۔ ان پر نماز ادا کرنا اور غسلِ جنابت کرنا گراں گزرنے لگا۔ اسی طرح موسمِ گرما میں روزے رکھنا دوبھر ہوا۔ ادائیگی زکوٰۃ بھی ان کو مشکل نظر آنے لگی۔ اس دور میں ان ملاحدہ کے زیرِ اثر اتباعِ خواہش، زنا اور شراب کو فروغ ہوا۔[۳۲]

عہدِ مہدی میں سمرقند میں عبداللہ ابن المقنع نے دعوئ الوہیت کیا اور مسلمانوں کے خلاف فوج آرا ہوا۔ دارالخلافہ سے اس کے خلاف ایک لشکرِ جرار بھیجا گیا جس نے اس کے متبعین کی اکثریت کو جہنم واصل کیا۔ مہدی اور ہادی کو خدا نے توفیق عطا فرمائی اور اُنھوں نے حتی الوسع زندقہ و الحاد کو دبایا۔[۳۳] ہارون الرشید کے آخری ایامِ حکومت اس فتنہ نے دوبارہ سر اٹھایا اور اس بار رؤسائے عرب اور ملوکِ عجم بھی گروہ ملاحدہ میں شامل ہو گئے۔ عباسیوں کے اکثر وزیر اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس زمانے میں زندقہ و الحاد کی ہوا کچھ ایسی چلی کہ اکثر ہاشمی بھی گمراہ ہو گئے، ان میں سے یعقوب بن العقیل بن عبدالرحمٰن بن عباس بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نے

---

[۳۱] ایضاً، ورق ۲۶ ب [۳۲] ایضاً۔

[۳۳] ایضاً، ورق ۲۷ الف۔

اپنی بیٹی کو حمل کر دیا اور اسی وجہ سے وہ عوام میں زندیق کے لقب سے مشہور ہوا۔[۳۴]

المعتصم کے عہدِ خلافت میں بابک نامی ایک آدمی نے مذہب الحاد کا پرچار شروع کیا۔ خلیفہ نے اس کے مقابلے پر پے در پے لشکر روانہ کیے تب کہیں اس کا زور ٹوٹا۔ خلیفہ المتوکل کے عہد میں قرامطہ نے سر اٹھایا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ حجاز، عراق اور سندھ پر قابض ہو گئے۔ اُنھوں نے حجاز کے قافلوں کو لوٹنا اپنا شعار بنایا اور ان کی جرأت یہاں تک بڑھی کہ وہ بیت اللہ سے حجرِ اسود بھی اُکھاڑ کر لے گئے۔[۳۵]

اسی زمانے میں باطنی فرقے کا ظہور ہوا۔ یہ لوگ خود کو شیعہ اسمٰعیل بن جعفر صادقؒ کہلاتے تھے۔ انھوں نے کچھ باتیں تو مجوس سے اخذ کیں اور باقی احکام فلاسفہ سے مستعار لیے۔ اُنھوں نے باطنی تعلیم کے بہانے احکامِ شریعت ساقط کر دیے۔ ان کے طریقے کا کسی نے ان الفاظ میں کیا خوب تجزیہ کیا ہے "ظاہر مذہب شیعہ باطن مذہب الحاد و کفر"۔[۳۶]

ملتان میں خدا نے شیخ حمید افغانی کو توفیق دی اور اس نے قرامطہ کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح سلطان محمود غزنوی نے بھی تائیدِ ایزدی سے ان پر ضربِ کاری لگائی۔ ایران میں دیالمہ نے بھی لباسِ تشیع میں سر اُٹھایا اور اپنی قلمرو میں الحاد کو فروغ دیا۔ وہ بھی سلطان محمود کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوئے۔[۳۷]

---

[۳۴] ایضاً
[۳۵] ایضاً، ورق ۲۸ الف
[۳۶] ایضاً، ورق ۲۹ ب
[۳۷] ایضاً ورق ۳۰ ب

اقصائے مغرب میں اسماعیلیہ نے، جو اس دیار میں عبیدیہ کے نام سے معروف ہیں، "ہزار لحاف گمنامی برداشت" وہ کچھ تو خیر السلاطین صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں برباد ہوئے اور بقیہ کو سلطان سنجر نے تہ تیغ کیا۔ اس کے بعد محمود بسیخوان اُٹھا اور اس نے زندقہ و الحاد کا پرچار شروع کیا۔ اس کی موت کے بعد اڑھائی سو سال تک الحاد کا نام سننے میں نہ آیا۔ اسمٰعیل صفوی کے تخت نشین ہوتے ہی زندقہ و الحاد میں از سرِ نو جان پڑ گئی[۳۸]

ہندوستان میں زندقہ و الحاد کا آغاز اس طرح ہوا۔

> "دربار شاہی سلطان عظیم الشان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ حافظا اللہ عنہ شیخ ابوالفضل ناگوری بساط آئین خسارت قرین را در مملکت ہندوستان گسترد، سرگذشت محمود بسیخوان و شیخ ابوالفضل ناگوری چون بواقعی گوش آشنائے مردم نیست و نیز در تاریخ کما ینبغی نگاشتہ نشدہ این کمترین درین محل ثبت می نماید[۳۹]"

محمود بسیخوان خوزستان کے ایک موضع بسیخوان کا رہنے والا تھا۔ وہ نوجوانی میں طلبِ حق میں گھر سے نکلا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ وہ آبادی سے باہر عبادت و مراقبہ میں مشغول رہتا اور درختوں کے پتے اور گھاس کھا کر گزر بسر کرتا۔ ایک دن وہ ایک ندی کے کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا کہ اُسے پانی میں کوئی چیز بہتی نظر آئی۔ جب وہ چیز اس کے قریب آئی تو اس نے

---

[۳۸] ایضاً - ورق ۱۳۱ الف

[۳۹] ایضاً۔

"

اُسے بغور دیکھا تو وہ ایک تر و تازہ گاجر تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس گاجر کو پکڑ لیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے اُسے کھا گیا۔ اس کے بعد وہ ہر روز وقتِ مقررہ پر وضو کے لیے ندی پر پہنچتا اور ایک بہتی ہوئی گاجر اس کی طرف آتی اور وہ اُسے پکڑ کر کھا لیتا۔ وہ اس پر خوش تھا کہ خدا نے اس کے رزق کا اس طرح انتظام کر دیا ہے۔

محمود بسیخوانی کو گاجریں کھاتے ہوئے دو ماہ گزر گئے تو اس کے دل میں یونہی ایک خیال آیا کہ دیکھنا تو چاہیے کہ یہ گاجریں کہاں سے آتی ہیں۔ اگلے دن وہ وقتِ مقررہ سے پہلے ندی پر پہنچا اور پانی کے بہاؤ کے خلاف چل پڑا۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک برہنہ عورت ندی کے کنارے بیٹھی:

زروکے را در محل مخصوص خود میفرستد و می برآرد و ساعتے:
نیک بداں عمل قیام نمود چوں از کار پرداخت و آتش تونا
او فرونشست آں زروک را در آب از دست فرو ہشت[۱۴۵]

محمود نے دور سے یہ ماجرا دیکھا تو خدا کو مخاطب کر کے کہنے لگا " اے خدا تو اپنے مخلص بندوں کو ایسی چیزیں کھانے کو دیتا ہے؟ " اس واقعہ کے بعد وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ وہ اسلام سے پھر گیا اور اس نے الحاد کا پرچار شروع کیا۔ اس نے اپنے عقائد پر تیرہ رسالے لکھے جن میں سے " بحر و کوزہ " سب سے گیا گذرا ہے۔ " مضامینی کہ وقتی در آنجا خوردہ گوش از شنیدن آں قے میکند " اس " ملعون " کے مذہب کے

---

[۱۴۵] ایضاً ۔ ورق ۱۳۱ ب

رؤسا میں سے شریف آملی اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا اور ابوالفضل کا دستِ راست بنا[۱۴۱]

شریف آملی کا شمار ملاحدہ میں ہوتا ہے۔ وہ کسی زمانے میں بلخ میں مولانا محمد زاہد نبیرۂ مخدومی شیخ حسین خوارزمیؒ کی خانقاہ میں قیام کے ارادہ سے آیا لیکن جب انھیں اس کے عقاید معلوم ہوئے تو انھوں نے اُسے اپنی خانقاہ سے نکال دیا۔ بلخ سے نکل کر وہ دکن چلا آیا اور وہاں اپنے عقائد کا پرچار کرنے لگا۔ دکن میں لوگ اس کے قتل کے درپے ہوئے تو وہ شمالی ہندوستان چلا آیا۔ کسی نہ کسی طرح وہ اکبر کے حضور میں باریاب ہوا اور پہلی ہی ملاقات میں اس نے "حرفہائے ناہموار" کہے جو بادشاہ نے پسند کئے۔ اکبر نے اُسے ہزاری منصب دے کر اپنے مقربین کے زمرہ میں داخل کر لیا۔ وہ محمود بسیخوانی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بنگال میں لوگوں کو مراتب چہارگانہ کی، جو ابوالفضل کے اجتہاد کا نتیجہ تھے، تلقین کیا کرتا تھا۔ اس نے بھی **بحر و کوزہ** کی طرز پر "مہملات" پر مشتمل ایک کتاب لکھی تھی[۱۴۲]

شیخ مبارک ناگوری کا شمار "دانشمند ملاؤں" میں ہوتا تھا اور اور وہ سید رفیع الدین شیرازی کا شاگرد تھا۔ شیخ مبارک کی شادی لاڈو سے ہوئی جس کے بطن سے فیضی، ابوالفضل، ابوالخیر، ابوالمکارم اور ابوالبرکات پیدا ہوئے۔ شیخ کے مذہب کے متعلق خواجہ کلاں رقمطراز ہیں

---

[۱۴۱] ایضاً، ورق ۳۲ الف

[۱۴۲] ایضاً، ورق ۳۲ ب

"در ہر عصر ہمان مشرب و مذہب شعار وقت خود می ساخت کہ ملوک و امرای عصر بدان مذہب رغبت میداشتند"[43] شاید ایسے ہی شخص کے لئے کسی نے کہا ہے۔ ع

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

شیخ مبارک کو سلطان ابراہیم لودھی کے عہد میں کٹر سنی سمجھا جاتا تھا اور سوریوں کے عہد حکومت میں لوگ اُسے مہدویوں کے زمرہ میں شمار کرتے تھے، ہمایوں کے زمانۂ حکومت میں وہ خود کو نقشبندی صوفی ظاہر کرتا تھا۔ اکبر کے عہد میں وہ مشربِ اباحت پر کاربند اور صلح کل ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ شیخ مبارک کی طرح اس کے فرزند ابوالفضل میں بھی استقلال نام کو نہ تھا۔ خواجۂ کلاںؒ رقمطراز ہیں "دل بالکل وی بہیچ دین و ملت قرار نمی گرفت" اس نے مجوس و نصاریٰ و یہود سے مذہب کے متعلق معلومات حاصل کیں اور انھیں لے کر اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ اکبر کی صحبت کو اپنے لئے تائید غیبی سمجھتا تھا۔

ابوالفضل نے شاہی فرامین بھیج کر دنیا بھر سے دوسرے مذاہب کی کتابیں حاصل کیں اور اسی شوق میں متھرا، بنارس، جگن ناتھ اور سومنات سے

---

[43] ایضاً، ورق ۳۳ الف (خواجہ باقی باللہؒ کے انتقال کے وقت خواجۂ کلاںؒ ابھی بچے ہی تھے۔ اس لئے ان کی تربیت خواجہ بزرگ کے خلیفہ خواجہ حسام الدینؒ نے کی۔ خواجہ حسام الدینؒ کی اہلیہ شیخ مبارک کی بیٹی اور فیضی اور ابوالفضل کی ہمشیرہ تھیں، اس لئے خواجۂ کلاںؒ کی اس خاندان کے متعلق روایات بڑی وزنی ہیں۔)

بھی کتابیں منگوائیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اس کی حیرت میں اضافہ ہوا اور وہ نہ صرف یہ کہ دہریہ ہوا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے اباحت میں قدم رکھا۔ اخلاق کے معاملے میں وہ کتبِ حکماء کو مقدم رکھتا تھا۔ ابوالفضل نے ایک کام اور کیا وہ یہ کہ "در رنگ ابنِ مقفع خبیثِ مذکور کلیلہ و دمنہ را بہ طرزِ خاص تحریر نمود و در مقامِ تمثیل و استشہاد حکایت وابیہ از نزد خود افزود ـــ" (کفر و زندقہ کی یہ تمام منازل اس نے خود طے کیں اور) اس کے بعد شریف آملی سے ملا اور خوب ملحد ہوا اور بالآخرہ باشارۂ بادشاہ زادہ عالمیان ولی عہد نورالدین محمد جہاں گیر" قتل ہوا۔

خواجۂ کلاںؒ ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ عوام کی گمراہی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ "ہوسناک اور اوباش" لوگوں کا ایک گروہ فقراء کی خانقاہوں میں "آش و نان" مہیا کر رہا ہے جس کے کھانے سے فقراء کی قوت فہم و ادراک میں نقص پیدا ہوتا ہے اور وہ وادیٔ الحاد میں جا نکلتے ہیں[۲۵]۔ بسا اوقات لوگ صوفیوں کی تحریروں کو پڑھ کر یا ان کے وعظ سن کر جادۂ شریعت سے دور نکل جاتے ہیں۔ خواجۂ کلاںؒ فرماتے ہیں کہ میرے والدِ بزرگوار خواجہ آفاق محمد الباقیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی بعض رباعیات میں وحدت الوجود کے مسائل پیش کئے ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ ۔ ازاین تصنیف خوب واقع نشدہ است[۲۶] اسی ضمن میں آپ نے

---

[۲۴] ایضاً، ورق ۳۳ ب [۲۵] ایضاً، ورق ۳۴ ب

[۲۶] ایضاً۔

یہ بھی فرمایا کہ مجھے بہت بعد جا کر معلوم ہوا ہے کہ "دارائی طریقۂ وحدۃ الوجود راہے است وسیع و راہِ توحید نسبت بآں شاہراہ کوچہ تنگی بیش نیست"[۴۷] اس خیال سے کہ طریقت کے بعض مقامات اور ان کے احوال عوام کے فہم سے بالاتر ہیں، آپ نے حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کو یہ نصیحت فرمائی تھی۔

"اگر بسخن گراید بطور علماء گراید نہ بطور صوفیہ واگر احیاناً بطور صوفیہ
گفتہ شود بہ اغلاق گراید کہ جز مخاطبت دقیقہ شناس دیگرے
نفہمد واز آنجا چیزی فرا نگیرد کہ موجب ذلّت و ہفوات وی شود"[۴۸]

(اگر حضرت مجدد الف ثانیؒ اس نصیحت پر عمل پیرا ہوتے اور اپنے مکتوب یازدہم کی اشاعت نہ فرماتے تو انھیں گوالیار میں سنّتِ یوسفی کی پیروی نہ کرنا پڑتی۔)

خواجہ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ ان حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں وہ دہریوں، طبیعیوں، اسماعیلیوں اور مباحیوں کی وجہ سے پیدا ہوئیں[۴۹]۔ اب حضرت بادشاہ دین پناہ، امام السلطنۃ والسلاطین، وقطب الخواقین زینہار زمان وزمین، وبادشاہ عالم وعالمین، مؤسس قواعد العقل والداد، دافع احکام الظلم، وقامع بنیان الحاد، نزہۃ الدہر وبہجۃ العصر الاسلام، عضد قوی واللحق برہان جلی، نجم ثاقب للمزذۃ والشیاطین، وشمس بازغ لاہل معرفت والیقین، محی الخلفاء الراشدین، ومنقبۃ امیر سید المرسلین، ظل اللہ الظلیل، امیر المومنین، صاحبقران ثانی، شہاب الدین محمد شاہجہان بادشاہ اطال اللہ عمرہٗ کو حکمائے یونان

---

[۴۷] ایضاً۔ [۴۸] ایضاً۔ [۴۹] ایضاً، ورق ۳، الف۔

اور فلاسفہ ناپسند ہیں اور اسی وجہ سے زندیق بھی اس سے خائف وترساں رہتے ہیں[۵۰]

آخر میں خواجۂ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ ان دنوں آئمۂ متقی کم رہ گئے ہیں جو دین کی غم خواری کریں اس لئے بادشاہ سے کہو کہ وہ یہ کام کرے[۵۱]

* * *

---

[۵۰] ایضاً، ورق ۳۵ الف

[۵۱] ایضاً، ورق ۳۶ب ، ۳۷ الف

پیر محمد شاہؒ اور ان کا نادر کتب خانہ

سید پیر محمد شاہ قادریؒ کا شمار احمد آباد کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے اور جس شاہراہ پر ان کی درگاہ واقع ہے وہ انہی کے نام کی نسبت سے پیر محمد شاہؒ روڈ کہلاتی ہے۔ آپ کی درگاہ احمد آباد (بھارت) میں مرجع خلائق ہے اور وہاں کے باشندے بلا تمیز مذہب و ملّت آپ کے دل وجان سے معتقد ہیں۔

آپ کا اسم گرامی سیّد محمد تھا لیکن عوام میں آپ سید محمد شاہ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی طرف سے حضرت سیّد عبدالقادر جیلانیؒ سے اور والدہ ماجدہ کی طرف سے حضرت سیّد بندہ نواز گیسو درازؒ سے جا ملتا ہے۔ ان نسبتوں سے دنیائے فقر و تصوف کے دو شریف خانوادوں کا مقدس خون آپ کی رگوں میں موجزن تھا۔ آپ بیجاپور میں ۱۵ر شعبان سنہ ۱۱۰۰ھ کو پیدا ہوئے، اتفاق سے آپ کے والد ماجد آپ کی ولادت سے پہلے ہی انتقال فرما گئے، اس لئے آپ کی تربیت کا بار آپ کے چچا سیّد عبدالرحمٰنؒ کے کندھوں پر پڑا۔

سید عبدالرحمٰن کا شمار اس عہد کے برگزیدہ قادری بزرگوں میں ہوتا تھا اور اطرافِ دکن میں آپ کے ہزارہا مرید تھے۔ آپ کا سلسلۂ ارادت چار واسطوں سے علامہ وجیہہ الدین گجراتیؒ اور پانچ واسطوں سے حضرت محمد غوث گوالیاریؒ سے جا ملتا ہے۔

سید محمد کی تعلیم کا آغاز سید عبدالرحمٰنؒ کی نگرانی میں ہوا۔ سات سال کی عمر میں آپ نے قرآنِ پاک حفظ کیا۔ جب آپ نو سال کے ہوئے تو چچا نے قادریہ سلسلہ میں بیعت سے مشرف فرمایا اور مکہ مکرمہ جا کر تحصیل علم کا حکم دیا۔ آپ نو عمری میں ہی مکہ مکرمہ میں حصول علم کے لئے وارد ہوئے۔ ان دنوں مکہ مکرمہ میں مولانا عبداللہ بن طرفہؒ، عبدالرحمٰن بن محمد ذہبیؒ، عبدالملک بن حسین عصامیؒ، ابوعبداللہ جمال الدین محمد بن احمد بن سعید عقیلہؒ، محمد بن شیخان بن عمر سالمؒ، مصطفیٰ بن فتح اللہ مکیؒ، شہاب احمد بن عبداللہ مکیؒ، شہاب احمد بن محمد دمیاطیؒ، شیخ قاسم بن محمد بغدادیؒ، محمد بن سلیمان مغربیؒ، سیّد محمد شلیؒ، اور ملا الیاس بن ابراہیم کورانیؒ جیسے جیّد علما موجود تھے۔ آپ نے ان میں اکثر بزرگوں سے کسبِ فیض کیا اور علوم مروجہ میں سے خاص کر تجوید اور تفسیر میں مہارت حاصل کی۔

مکہ مکرمہ میں چھ سال قیام کے بعد آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں ان دنوں علما کی ایک جماعت مصروفِ درس و تدریس تھی۔ ان میں سے خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کے تلمیذ رشید احمد یکدستؒ، مولانا اسعد اسکداریؒ، مولانا عبدالرحمٰن سمہودیؒ، مولانا عبدالکریم خلیفتیؒ، سید عبداللہ الحدادؒ، علامہ محمد بن ابراہیم کورانیؒ، محمد بن عبدالہادی سندھیؒ، اور مولانا علی

بن ابراہیم شروانیؒ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے سات سال ان بزرگوں کی خدمت میں رہ کر علومِ مروجہ کی تکمیل کی اور تیئیس برس کی عمر میں ان کی دعائیں لے کر احمد آباد روانہ ہوئے۔

جس سال آپ احمد آباد تشریف لائے اسی سال بہادر شاہ اوّل فوت ہوا اور جہاندار شاہ ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ ملک کے سیاسی حالات دن بدن مخدوش ہوتے چلے گئے اور امورِ سلطنت بادشاہ گروں کے ہاتھ میں آ گئے۔ مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف صوبوں کے صوبے دار آزاد ہو گئے۔ گجرات میں گائیکواڑ کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا اور اس نے ہمت سے کام لے کر سورت پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کے بعد گجرات میں مسلمانوں کی پوزیشن دن بدن خراب ہوتی چلی گئی اور مرہٹے طاقت پکڑتے گئے۔ احمد آباد کا مسلمان گورنر ان کے رحم و کرم پر ہی اپنے منصب پر برقرار رہ سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ تمام کاروبارِ حکومت پر مرہٹے حاوی ہو گئے اور انھوں نے احمد آباد کے آخری مسلمان گورنر جوانمرد خاں کو اس کے منصب سے الگ کر کے احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔

سید محمد شاہؒ سیاسی اتار چڑھاؤ کے اس زمانے میں اوّل اوّل تو شہر سے باہر محلہ راج پورہ میں بی بی کی مسجد میں قیام پذیر رہے لیکن بعد ازاں آپ نے مانک چوک کی جامع مسجد میں سکونت اختیار کر لی۔ اس مسجد میں آپ نے رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا جو آپ کے دمِ واپسیں تک جاری رہا۔

آپ پر وحدۃ الوجود کا رنگ بہت زیادہ غالب تھا اور اکثر سکر کی حالت میں رہتے تھے۔ جب کبھی صحو کی حالت میں ہوتے تو لکھنے

پڑھنے کی طرف توجہ فرماتے۔ آپ کی تصانیف میں عشق اللہ، نور الشیوخ، مجموعۂ رسائل، مکاشفات، غزلیات اور مراثی شامل ہیں۔ آپ شاعر بھی تھے اور اقدس تخلص کرتے تھے۔ آپ کا کلام اور اوّل الذکر دونوں کتابیں درگاہ کمیٹی نے شائع کر دی ہیں۔ آپ کے سوانح حیات ابوظفر ندوی نے تذکرۂ اقدس کے نام سے مرتب کیے تھے جو ۱۹۳۴ء میں اعظم گڑھ سے طبع ہو چکے ہیں۔

تذکرۂ اقدس پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے گجرات کے سُنّی بوہروں میں تبلیغ کا کام بڑے وسیع پیمانے پر کیا تھا اور ان کے عقائد درست کرنے میں آپ کا بڑا ہاتھ تھا۔ آج تک گجرات کے سُنّی بوہرے آپ کے بڑے معتقد ہیں اور ان کے ہاں یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ وہ نومولود بچّے کو آپ کے مزار کے پائینتی لا کر رکھتے ہیں اور جب کسی بچّہ کو مکتب میں بٹھاتے ہیں تو اس کی رسم بسم اللہ بھی آپ ہی کے مزار پر ادا کرتے ہیں۔

سیّد محمد شاہؒ کو علامّہ وجیہہ الدین گجراتیؒ سے بے حد عقیدت تھی اور ان کے مزار پر فاتحہ خوانی آپ کا روزمرّہ کا معمول تھا۔ جب آپ جامع مسجد مانک چوک سے علامّہ مرحوم کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے تشریف لے جاتے تو راستے میں اکثر ایک بڑھیا کی خیر و عافیت دریافت فرمانے کے لئے اس کی جھونپڑی کے باہر رُک جاتے۔ وہ اکثر آپ سے وہاں چند دن قیام فرمانے کی استدعا کرتی تو آپ ہمیشہ اسے یہی جواب دیتے "ہاں ہاں جب اس جگہ آؤں گا تو پھر اسی جگہ رہوں گا۔"

سیّد محمد شاہؒ نے ۲۶ر جمادی الاولیٰ سنہ ۱۰۶۳ھ کو وفات پائی۔ آپ نے

ذات پاک بودہ" سے مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے۔ حسن اتفاق سے آپ کو اسی بڑھیا کے جھونپڑے کے پاس دفن کیا گیا ہے۔ آج کل آپ کے عالی شان مقبرہ سے ملحق ایک نفیس مسجد، ایک خوبصورت مدرسہ، ایک پُر وقار خانقاہ ایک عمدہ سی لائبریری اور درگاہ کمیٹی کے دفتر کی پُرشکوہ عمارات موجود ہیں۔ درگاہ سے متعلقہ اوقاف کی آمدنی ایک لاکھ روپے سالانہ سے متجاوز ہے جو ان عمارات کی دیکھ بھال پر خرچ ہوتی ہے۔

سید محمد شاہؒ کو کتابیں پڑھنے اور نادر مخطوطات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ تذکرے ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کتابیں آپ کے مطالعہ میں رہتی تھیں وہ آپ کو حفظ ہو چکی تھیں۔ آپ کے انتقال کے بعد ان مخطوطات کو ایک کمرہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ درگاہ کمیٹی کے ارکان کی توجہ سے گذشتہ دس سال میں اس مجموعہ میں معتدبہ اضافہ ہوا اور آج پیر محمد شاہؒ لائبریری کا شمار برصغیر پاک و ہند کے بہترین کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک ان مخطوطات کی کوئی وضاحتی فہرست شائع نہیں ہوئی اس لئے ان مخطوطات کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ راقم نے اگست سنہ ۱۹۶۸ء میں ناظم کتب خانہ مولانا محمد سورتی کی عنایت سے اکثر و بیشتر مخطوطات سے استفادہ کیا اور اس ضمن میں ان میں سے چند نوادرات کا تعارف کروانا چاہتا ہوں۔

تفسیر ابی سعود عمادی

علامہ ابی سعود عمادیؒ ایک حنفی عالم تھے۔ آپ نے سنہ ۹۷۳ھ میں عربی زبان میں قرآن کی تفسیر دو جلدوں میں تحریر فرمائی تھی۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری میں اس تفسیر کا سنہ ۱۰۰۱ھ کا نوشتہ مکمل نسخہ موجود ہے۔

تفسیر بیضاوی

قاضی بیضاوی کی تفسیر متعدد بار شائع ہو چکی ہے اور اکثر دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا مخطوطہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ علامہ وجیہہ الدین گجراتیؒ کا تحریر فرمودہ ہے۔

تفسیر غرائب القرآن

یہ تفسیر مولانا حسن بن محمد بن حسین القمی معروف بہ نظام اعرج نے عربی زبان میں سنہ ۷۲۸ھ میں تحریر فرمائی تھی۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا مخطوطہ فن کتابت کا بہترین نمونہ ہونے کے علاوہ اپنی قدامت کے لئے بھی مشہور ہے۔

شرح فی معانی بعض الآیات القرآنیہ

یہ مختصر رسالہ کابل کے مشہور عالم دین ملّا محمد صادق حلوائیؒ کی تالیف ہے۔ اکبر کا بھائی حکیم میرزا اور خواجہ باقی باللہؒ دونوں اسی بزرگ کے شاگرد تھے۔ نفس مضمون کے لحاظ سے یہ بے بدل تالیف ہے۔

سورۂ فاتحہ

کسی کاتب نے خطِ غبار میں سورۂ فاتحہ کے اندر پورا قرآنِ پاک نسخ میں لکھا ہے جو فن خطاطی کا بہترین شاہکار ہے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں خط غبار میں کسی کاتب کا "یا حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ" کے اندر لکھا ہوا قرآن پاک محفوظ ہے۔

ترجمہ قرآن پاک

سنہ ۱۱۰۲ھ کا تحریر شدہ قرآن پاک کا بین السطور فارسی ترجمہ پیر محمد شاہؒ لائبریری میں موجود ہے۔ بعض حضرات کا یہ دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے شاہ ولی اللہؒ نے قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا ان کی خدمت میں اتنا ہی

عرض کرنا کافی ہوگا کہ یہ ترجمہ شاہ صاحبؒ کی ولادت سے بارہ برس قبل ہوا تھا۔

کتاب الفقہ حنفی

شیخ ابوحفص نجم الدین عمر بن محمدؒ ایک مشہور حنفی عالم ہو گذرے ہیں، انہوں نے عربی نظم میں فقہ حنفی پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس لائبریری میں جو مخطوطہ موجود ہے وہ سنہ ۱۱۶۶ھ کا کتابت شدہ ہے مضمون کے اعتبار سے بھی یہ ایک نادر مخطوطہ ہے۔

حاشیہ و شرح ہدایہ

حکیم ہاشمی نام کے ایک بزرگ نے پہلے ہدایہ پہ حاشیہ لکھا بعد ازاں پوری کتاب کی شرح لکھی۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری میں اس کتاب کا جو ضخیم نسخہ ہے وہ فاضل مصنف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

ترغیب الصلوٰۃ

علاءالدین خلجی کے عہد میں محمد بن احمد زاہد نام کے ایک فاضل نے سنہ ۶۵۹ھ میں ترغیب الصلوٰۃ کے نام سے ایک ضخیم کتاب تحریر کی تھی، پیر محمد شاہؒ لائبریری میں اس کے دو مکمل نسخے محفوظ ہیں۔

تیسر الاحکام

ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادیؒ صاحب تفسیر بحر مواج نے علم فقہ پہ ۳۴ ورق کا ایک مختصر سا رسالہ فارسی زبان میں نظم بند کیا تھا۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا مخطوطہ عہد شاہجہانی میں سنہ ۱۰۴۱ھ میں درطۂ تحریر میں آیا تھا۔

فتاویٰ تتارخانیہ

اس کتاب کا مکمل سیٹ میں نے اوّل بار پیر محمد شاہؒ لائبریری میں دیکھا ہے

ہماری پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی، جو اپنے مخطوطات کے لئے پاکستان بھر میں مشہور ہے، اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

فوائد فیروز شاہی

شرف الدین محمد الحطائیؒ نے فیروز تغلق کے عہد میں فقہ پہ ایک ضخیم کتاب فوائد فیروز شاہی کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے مخطوطے کلکتہ، بانکی پور، انڈیا آفس اور مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں۔ پیر محمد شاہ لائبریری کا مخطوطہ سنہ ۹۷۳ھ کا نوشتہ ہے۔

رسالہ اسماء اہل بدر

یہ مختصر سا رسالہ الشیخ ابو بکر المحدثؒ کی تالیف ہے، پیر محمد شاہؒ لائبریری کے مخطوطہ کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ فاضل مصنف کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

مرأة العارفین

سلطان فیروز تغلق کے خواہر زادے شیر خان مسعود بک نے عارفین کے سوانح اس عنوان سے جمع کئے تھے، پیر محمد شاہؒ لائبریری میں سنہ ۱۱۱۶ھ کا نوشتہ ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔

مناقب العارفین

اس نام کا ایک مخطوطہ اس لائبریری میں موجود ہے لیکن مصنف کا نام اس پر درج نہیں، نفس مضمون کے لحاظ سے یہ ایک نادر نسخہ ہے۔

سفر نامۂ مخدوم جہانیاں

حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے سفر نامہ کا ایک مخطوطہ اس لائبریری میں موجود ہے۔

جنگ نامہ اعظم شاہ و معظم شاہ

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کے درمیان حصولِ تخت کے لئے جو جنگ ہوئی تھی اس کے مکمل کوائف نعمت خان عالی نے سات ابواب میں قلم بند کر لئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مجموعۂ شیرانی میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ لیکن پیر محمد شاہ لائبریری کے مخطوطہ کا متن کافی حد تک صاف ہے۔

دیوانِ نومیدی

نومیدی ہمایوں کا ہم عصر شاعر تھا۔ اس کا دیوان ایک بار شائع ہو چکا ہے لیکن اب ناپید ہے۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا مخطوطہ ہر لحاظ سے مکمل اور دیدہ زیب ہے۔

دیوانِ فیضی

فیضی کا ایک مکمل دیوان پیر محمد شاہؒ لائبریری میں موجود ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے ادارہ تحقیقاتِ پاکستان کی طرف سے کلیاتِ فیضی شائع کی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ فاضل مرتب نے اس نسخہ سے بھی استفادہ کیا ہے یا نہیں —

راگ درپن

عہدِ شاہجہانی میں جتنے موسیقار ہو گذرے ہیں ان کا ایک تذکرہ فقیر اللہ سیف خان نے اس عنوان سے تحریر کیا تھا۔ علاوہ ازیں فنِ موسیقی پر بھی فاضل مصنف نے کافی کچھ لکھا ہے۔ علی گڑھ میں بھی راگ درپن کا ایک ناقص نسخہ موجود ہے۔ اتفاق سے پیر محمد شاہؒ لائبریری کے نسخے کے بھی چند اوراق غائب ہیں۔ اس کتاب کے مخطوطے پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور

بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں بھی موجود ہیں۔

مکاشفاتِ عینیہ

امام ربانی مجدد الف ثانی کی مکاشفاتِ عینیہ کا ایک مکمل نسخہ اس لائبریری میں موجود ہے۔ اس نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ امام ربانی کی وفات کے صرف سترہ سال بعد ۱۰۵۱ھ میں درطۂ تحریر میں آیا تھا۔

رسالہ علوم الہامیہ و معارف لدنیہ

یہ بھی حضرت امام ربانیؒ کی تالیف ہے، ہر چند کہ سالِ کتابت مخطوطہ پر درج نہیں تاہم کتابت کے اعتبار سے یہ ایک قدیم نسخہ ہے۔

خیالات العشاق

حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ حضرت ابو حفص شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے مرید اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مصاحب تھے۔ اس لائبریری میں آپ کی اس تالیف کے دو نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ۱۰۹۱ھ میں درطۂ تحریر میں آیا تھا۔

رسالۂ غوثیہ۔

اس نام کا ایک مختصر سا رسالہ سید بندہ نواز گیسو درازؒ کی طرف منسوب ہے۔ ویسے آپ کثیر التصانیف بزرگ ہو گذرے ہیں، تاہم اس رسالہ کی صحت کے متعلق کچھ لکھنا محال ہے۔

مرصاد العباد۔

اس لائبریری کے نوادرات میں مرصاد العباد بڑا اہم مخطوطہ ہے۔ یہ ابوبکر بن عبداللہ بن محمد بن شاہوار اسدی رازیؒ نام کے ایک بزرگ کی تالیف ہے۔ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا مخطوطہ سید عبدالملک کی فرمائش پر حسین

بن عماد بن محمد نام کے ایک کاتب نے ۱۰۱۶ھ میں لکھا تھا، بعد ازاں علی اصغر نامی ایک شخص نے اسے جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر جہانگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ تحریر موجود ہے "مرصا دالعباد فرستادۂ علی اصغر خویش آقا عرب کہ از مستقر الخلافۃ اکبر آباد ارسال حضور نمودہ۔ بتاریخ ہفتم ماہِ شوال ۸ جلوس ہمایوں بتحویل خواجہ مطلوب تحویل دار کتاب خانہ سرکار علیہ داخل جمع نمودہ شد" یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ کسی بدذوق نے شاہی مہریں مٹادی ہیں۔ بہرحال یہ کتاب جہانگیر کے ذوقِ علم کی آئینہ دار ہے۔

غرۃ الازیاج

غرۃ الازیاج المعروف بہ زیچ ہندی ابوریحان البیرونی کی تصنیف ہے، اور ناظم کتاب خانہ کا دعویٰ ہے کہ پیر محمد شاہؒ لائبریری کا نسخہ دنیا بھر میں واحد مخطوطہ ہے۔ حال ہی میں حکومت ہندوستان نے اس مخطوطہ کا عکس حاصل کیا ہے۔ راقم کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اسے حکومت ہندوستان نے شائع کر دیا ہے یا ابھی تک یہ طباعت کے مراحل سے گذر رہی ہے۔

الہلال

مخطوطات کے علاوہ اس لائبریری میں مولانا آزاد کے مجلّہ الہلال کا مکمل سیٹ بھی محفوظ ہے جو حال ہی میں آگرہ کے کسی علم دوست بزرگ نے لائبریری کے لئے مرحمت فرمایا ہے۔

* * *

شاہانِ مغلیہ کا ذوقِ موسیقی

برصغیر پاک و ہند کے اکثر حکمران فن موسیقی میں بڑی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ معز الدین کیقباد[1]، سلطان جلال الدین خلجی[2] اور قطب الدین مبارک[3] کا اکثر وقت اسی شغل کی نذر ہوتا تھا۔ سلطان محمد بن تغلق کی ایسی تصاویر موجود ہیں جن میں وہ تخت پر بیٹھا کنیزوں کے گانے سے محظوظ ہو رہا ہے[4]۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس فن لطیف کی بڑی ترقی ہوئی[5]، اور جہاں علم فقہ پر فوائد فیروز شاھی، فتاویٰ تتارخانیہ اور فقہ فیروز شاھی

---

[1] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۸۹ - ۱۸۸

[2] ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۲۷،

[3] ایضاً، جلد ۲، ص ۲۱۶، "در مدت چہار سال و چہار ماہ کار نبود مگر شراب خوردن و سماع شنیدن"۔

[4] آغا مہدی حسن، رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق، مطبوعہ لندن ۱۹۳۸ء، تصویر بالمقابل ص ۳۰۔

[5] شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۳۶۸۔ سلطان فیروز تغلق کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے عفیف لکھتا ہے "کار و بار مطربان دہلی بجائے رسید کہ فرزندان خرد سال برابر خرد کردہ از شہر دہلی تا فیروز آباد می آرند"

جیسی بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں وہاں علمِ موسیقی پر بھی فرید الزمان فی معرفت الالحان اور غنیۃ المنیۃ[۵] جیسی قابلِ قدر کتابیں درطۂ تحریر میں آئیں۔ جونپور کی شرقی حکومت کے تاجدار سلطان ابراہیم کا اکثر و بیشتر وقت اسی شوق کی نذر ہوتا تھا۔ اس نے فنِ موسیقی پر سنسکرت زبان میں شرومنی سنگیت کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی[۶] جس میں اس فنِ لطیف کے رموز و اسرار پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے پوتے سلطان حسین کو اس فن میں مجتہد کا درجہ حاصل تھا اور اس نے خیال، جونپوری، حسین کا نہڑا اور حسینی ٹوڈی جیسے راگ ایجاد کیے[۷]۔ اکثر مورخین نے اپنی کتابوں میں سلطان حسین شرقی کا ذکر THE MUSICIAN KING OF JAUNPUR کے عنوان کے تحت کیا ہے[۹]۔ کشمیر کا سلطان زین العابدین بھی موسیقی کا بڑا سرپرست تھا۔ مورخ کشمیر منشی محمد دین فوق تاریخ بڈشاہی میں رقمطراز ہیں کہ سلطان زین العابدین کو ساز و سرود سے بڑی رغبت تھی اور وہ اس فن کو خوب جانتا اور راگ کی ماہیت کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے ملا عود اور جمیل جیسے مغنیوں کو، جو صاحبِ تصانیف اور کئی راگ راگنیوں کے موجد تھے، خراسان سے کشمیر بلایا اور ان کی خوب آؤ بھگت کی[۱۰]۔ اس کے ایک درباری پنڈت

---

[۵] ایتھے، فہرست مخطوطات فارسیہ، انڈیا آفس لائبریری لندن مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۳ء مخطوطہ نمبر ۲۰۰۸

[۶] ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۱۷

[۷] عطیہ بیگم فیضی، دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۶۵

[۹] ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۱۲

[۱۰] محمد دین فوق، تاریخ بڈشاہی۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۱۲ء، ص ۲۳۸۔

بودی بٹ نے علم موسیقی پہ زین نام کی ایک کتاب لکھ کر سلطان کی خدمت میں پیش کی۔[۱۱۱] سلطان کے ذوق و شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ گاہ گاہے کتب موسیقی اور گویوں کا تبادلہ گوالیار کے راجہ کے ساتھ کیا کرتا تھا۔[۱۱۲] گوالیار کے راجہ مان سنگھ تنوار کو تمام گویوں نے استاد تسلیم کیا ہے، اس نے دھرپد راگ ایجاد کیا[۱۱۳] اور فن موسیقی پہ مانکتوہل نام کی ایک کتاب لکھی،[۱۱۴] جس پہ شمالی ہندوستان کے گویوں کا مدتوں تک مدار رہا۔ اس نے گوالیار میں ایک میوزک اکیڈمی بھی قائم کی جہاں سے بڑے نامی گرامی گویے تربیت پا کر نکلے۔ بخشو نائک، جس کی بیٹی سے تان سین نے راگ سیکھا تھا، راجہ مان سنگھ تنوار کا تربیت یافتہ تھا۔ مالوہ کا فرمانروا باز بہادر بھی فن موسیقی میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں مالوہ میں اس فن کو بہت عروج ہوا۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر شراب و نغمہ کا بڑا دلدادہ تھا، ویسے بھی شراب و نغمہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے نے عمر خیام نے کہا ہے۔

مے بر کفِ من نہ و برآور غلغل   لا جام شراب دے لبالب بالکل

---

[۱۱۱] ایضاً، ص ۳۴۰

[۱۱۲] ڈاکٹر عبدالحلیم، السیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۱۸

[۱۱۳] عطیہ بیگم فیضی، دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۲۳

اا پروفیسر سنتری پدا نبد و پادھیائے، دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ بمبئی، طبع اول، ص ۵۶

[۱۱۵] سیف خان، راگ درپن، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲ب

با نالۂ عندلیب و صوت بلبل   کس وقت نگر، جب ہوں چہکتے بلبل
بے نغمہ اگر مدام بدے مے خوردن   بے نغمہ اگر شراب ہوتی جائز
مے در سر شیشہ ہا نہ کردے قلقل[۱۰۵]   سنتے نہ کبھی شیشے کے منہ سے قلقل[۱۰۶]

فتح ہندوستان سے قبل اس کی عمر جس علاقے میں گذری اس کی فضا میں چاروں طرف میر علی شیر نوائی اور مولانا بنائی کے نغمے گونج رہے تھے۔ میر علی شیر خود ماہر فنون نواز ہونے کے علاوہ موسیقاروں کا بڑا خیال رکھتا تھا[۱۰۷]۔ اس کے متعلق عباس پرویز رقمطراز ہیں۔

چون خود موسیقی می دانست بتربیت   وہ چونکہ خود موسیقی داں تھا اس لیے
طبقۂ آہنگسازان و موسیقیدانان   وہ سازندوں اور گویوں کی تربیت
می پرداخت[۱۰۸]   کا بڑا خیال رکھتا تھا۔

مولانا بنائی، شیبانی خان کے دربار میں ملک الشعراء کے منصب پر فائز تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ وہ موسیقی کے بھی ماہر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے متعلق میر خواند لکھتا ہے۔

از علم تصوف و موسیقی وقوف   وہ علم تصوف اور موسیقی میں
کامل داشت[۱۰۹]   پوری دسترس رکھتے تھے۔

---

[۱۰۵] عمر خیام، رباعیات، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۴۹ء، ص ۶۲

[۱۰۶] آغا شاعر قزلباش، خمکدۂ خیام، مطبوعہ رفاہ عام پریس، لاہور۔ ص ۱۹

[۱۰۷] دولت شاہ سمرقندی، تذکرہ، مطبوعہ تہران ۱۳۳۰ش، ص ۵۶۹

[۱۰۸] عباس پرویز، مقدمہ، روضۃ الصفا، مؤلفہ میر خواند، جلد اوّل، مطبوعہ تہران ۱۳۳۸ ش، ص "ط"

[۱۰۹] میر خواند، روضۃ الصفا، جلد ہفتم، مطبوعہ تہران ۱۳۳۹ش، ص ۲۸۱

بابر نے بھی اپنی تزک میں مولانا بنائی کے ماہرِ موسیقی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔[۲۰] بابر کے عہد میں ہرات میں غلام شادی، حافظ حاجی، جلال الدین محمود، نل محمد عودی، شیخ نائی اور علی شیر بیگ جیسے باکمال موسیقار موجود تھے۔ بابر نے ان سب کے کمالِ فن کا اعتراف اپنی تزک میں کیا ہے۔[۲۱] ماوراُالنہر میں بابر کے حریف عبیداللہ خان ازبک کو فنِ موسیقی میں بڑا کمال حاصل تھا اور اس کی مرتب کردہ دھنیں عوام میں بے حد مقبول تھیں۔ حیدر دوغلات کا کہنا ہے کہ وسطِ ایشیاء کے شہروں اور قصبوں میں عوام اسی کے ترتیب دئے ہوئے نغمے الاپتے پھرتے تھے۔[۲۲] اس ماحول میں رہتے ہوئے بابر کو بھی موسیقی سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور تزکِ بابری کے بعض اندراجات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موسیقی کے زیر وبم سے کماحقہٗ واقف تھا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں موروثی خصوصیتوں سے کافی بہرہ اندوز تھا اور اس کے دل میں علمی ذوق ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ اس نے ہفتہ میں دو دن موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لئے وقف کر دئے تھے۔ خوندامیر ہفتہ کے مختلف دنوں میں ہمایوں کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے دوشنبہ اور چہار شنبہ کے ضمن میں لکھتا ہے:۔

---

[۲۰] تزکِ بابری، مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۸ھ، ص ۱۱۴

[۲۱] ایضاً، ص ۱۱۵، ۱۱۲، ۱۲۰

[۲۲] حیدر دوغلات، تاریخ رشیدی، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، آذر کلکشن نمبر ۴۹، ورق ۲۴۰ الف
"این زمان در افواہ اہلِ طرب از تصنیفات او ہست۔"

درین دو روز با جوانان قمر پیکر صحبت داشتہ بامتزاجِ نغمات والحانِ ساز وآواز از دربار زیب و زینت بخشید۔[۲۳]

یہ دو دن بادشاہ قمر پیکر جوانوں کی صحبت میں بسر کرتا اور ملک کے ساز و نغمہ سے (محفل کی) رونق دوبالا کرتا تھا۔

شاہی دربار کے علاوہ کبھی کبھی شاہی حرم میں بیگمات کی موجودگی میں مجلس طرب منعقد ہوا کرتی تھی جس میں ۔ سازندھا و گویندھا ۔ اپنے اپنے فن کا کمال دکھایا کرتے تھے۔[۲۴]

مرأتِ سکندری کی روائت ہے کہ فتح مانڈو کے بعد ہمایوں تین صد جنگی قیدیوں کو قتل کروانا چاہتا تھا، اتفاق سے ان میں سلطان بہادر شاہ گجراتی کا درباری گویا منجھو بھی تھا۔ حسنِ اتفاق سے ایک ہندو راجہ کا اُدھر سے گذر ہوا اور اس نے منجھو کو پہچان لیا۔ راجہ نے ہمایوں سے اس کی جان بخشی کی سفارش کی، ہمایوں کا ایک درباری خوشحال بیگ قورچی جو ایک بار سلطان بہادر شاہ کے دربار میں ہمایوں کا ایلچی بن کر گیا تھا، وہ منجھو کے مقام سے واقف تھا۔ اس نے بھی موقع محل دیکھ کر ہمایوں سے کہا "این منجھو کلاونت پادشاہ لولیان است"[۲۵] بادشاہ نے منجھو کو کچھ سنانے کا حکم دیا۔ منجھو نے بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی یہ غزل چھیڑی :۔

---

[۲۳] خواندامیر، قانونِ ہمایونی، مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۹۴۰ء، ص ۳۸

[۲۴] گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۲

[۲۵] سکندر بن محمد، مرآۃ سکندری۔ مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۸۹۰ء ص ۲۵۰

کسے نماند کہ اُو را بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی[26]

منجھو کا گانا ختم ہونے سے قبل ہی ہمایوں کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے سُرخ لباس اُتار کر سبز لباس زیب تن کیا۔ بعد ازاں منجھو کی سفارش قبول کرتے ہوئے ہمایوں نے تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا۔

ہمایوں نے منجھو کو اپنا مقرب بنا کر انعام و اکرام سے نوازنا شروع کیا لیکن اس کے باوجود وہ موقع پا کر بھاگ نکلا اور بہادر شاہ کے پاس جا پہنچا۔ ہمایوں کو اس کے فرار کی خبر ملی تو اس نے بے ساختہ کہا۔

کم بختی او بر این داشت و الّا ما	یہ اس کی بدبختی تھی جو اس نے
این قدر نوازش می فرمودیم کہ	ایسا کیا ورنہ ہم اسے اتنا انعام و
ہرگز نہ سلطان بہادر را یاد نمی	اکرام دیتے کہ وہ سلطان بہادر شاہ
آورد[27]	کا نام زبان پہ نہ لاتا۔

سکندر بن محمد کی روائت ہے کہ جب منجھو ہمایوں کے دربار سے بھاگ کر سلطان بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے مسُرت کے ساتھ کہا۔

دیگر مرا آرزوئی نماندہ آنچہ از	اب میری اور کوئی خواہش نہیں رہی

---

[26] شاہنواز خان، مرأت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر فارسی ۲۴، ورق ۲۹۴ب

[27] مرآۃ سکندری، ص ۲۵۰

خدا میطلبیدم بمن رساند[28]　　　میں نے جو کچھ خدا سے مانگا وہ پالیا

موسیقی کی سرپرستی میں صوفیائے کرام بھی بادشاہوں سے کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ شاہی درباروں کے باہر صوفیائے کرام کی خانقاہیں موسیقی کا سب سے بڑا گہوارہ سمجھی جاتی تھیں۔ ہمایوں کے عہد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ چشتیہ سلسلہ کے سربراہ تھے اور آپ کثرت کے ساتھ سماع سنتے تھے۔ لطائفِ قدوسی کے اندراجات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر ہر وقت جذب و مستی کا عالم طاری رہتا تھا۔ آپ کے صاحبزادے

---

[28] ایضاً۔ **نوٹ**:۔ ا۔ سکندر بن محمد نے اس گویئے کا نام منجھو لکھا ہے۔

(مرأۃ سکندری، ص۔ ٢٥٠)

ب۔ ہمایوں کے سوانح نگار بنرجی نے بھی اس کا نام منجھو ہی لکھا ہے۔

(ہمایوں بادشاہ، مطبوعہ کلکتہ ١٩٣٨ء، ص ١٣٤)

ج۔ شاہنواز خان نے اس کا نام بیجو لکھا ہے۔

(مرأت آفتاب نما، ورق ٢٩٤ ب)

د۔ عطیہ بیگم فیضی نے بھی اس کا نام بیجو ہی لکھا ہے۔ ان کے خیال میں اس نے ایک ٹوڈی بھی ایجاد کی تھی جو سلطان بہادر شاہ کے نام کی رعایت سے "بہادری ٹوڈی" مشہور ہے

(دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ١٩٢٥ء، ص ٦٥)

ہ۔ ایشوری پرشاد نے اس گویئے کا نام بجوّ لکھا ہے۔

(اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا، مطبوعہ الٰہ آباد ١٩٣٠ء، ص ٦٤)

و۔ منشی محمد اکرم امام خان کے خیال میں اس کا صحیح نام بھنو ہے کیونکہ راجہ مان سنگھ تنوار نے مانکتوہل میں ایسے ہی لکھا ہے۔ (معدن الموسیقی، مطبوعہ لکھنؤ ١٩٢٥ء، ص ٢٧)

رقمطراز ہیں کہ ہمارے والد ماجد کی شادی کی تقریب میں جونہی ڈومنیوں نے یہ دوہڑا گایا۔

کہو کہہ کھول دینا شہہ دیکھا لوری
اس گھونگھٹ کی کارن شہہ ہاتھ مروڑی

حضرت قطبی را حال وجد غالب آمد و سوز عشق پیدا شد، از تخت عروسی افتادند و در تواجد رقص فرمودند و جامہا عروسی ہمان ساعت پارہ پارہ کردند[29]

حضرت قطب صاحب میں سوز عشق پیدا ہوا اور آپ وجد میں آگئے اور اسی عالم میں مسند عروسی سے نیچے گر پڑے۔ آپ نے فی الفور اپنا عروسی جوڑہ چاک کر ڈالا اور وجد کے عالم میں رقص کرنے لگے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے صاحبزادوں نے ان کی نشست و برخاست کے لیے جماعت خانہ کے صحن میں ایک چھپر ڈال دیا تھا اور اسی کے نیچے اکثر مجلس سماع منعقد ہوا کرتی تھی اور آپ سماع سنتے سنتے وجد میں آکر رقص کرنے لگتے۔ شیخ رکن الدینؒ نے لطائف قدوسی میں ایک محفل سماع کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

محمود قوال از گجرات آمدہ بود ہمان ساعت حاضر شدہ و سرود گفت حضرت قطبی را حالت بسیار و وجد بکمال پیدا شد آن چھپر را از صحن جماعت خانہ شکستہ کردہ بردن

محمود قوال گجرات سے (گنگوہ) آیا اور اسی لمحے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ محمود نے قوالی شروع کی جسے سن کر حضرت قطب صاحب کی حالت غیر ہوئی اور ان پر وجد طاری ہوا ایسی

---

[29] شیخ رکن الدین، لطائف قدوسی، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ، ص ۱۲

امدا ختند دور صحن رقص و تواجد	عالم میں آپ نے وہ چھپر جماعت خانہ کے صحن
شد[30]	سے اکھاڑ کر باہر پھینک دیا اور صحن میں
	رقص کرنے لگے ۔

چشتی اس کا اعتراف بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں کہ سماع کو عام کرنے میں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا بڑا ہاتھ ہے ۔ اس طرح سہروردی حضرات کا یہ کہنا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں موسیقی کی ترویج میں حضرت شیخ بہاءالدین زکریاؒ کی کوششوں کو بڑا دخل حاصل ہے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ موصوفؒ راگ کے زیر و بم[31] سے کماحقہٗ واقف ہونے کے علاوہ اس فن کے بڑے سرپرست تھے ۔ شاہنواز خان حضرت کے کمال فن کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

الیشان در تودی مالسری را و دھناسری	حضرت بہاالدین زکریا نے ٹوڈی مالسری
راضم نمودہ ملتانی دھناسری نامیدہ اند	اور دھناسری کو ملا کر ملتانی دھناسری بنائی
و این مرغوب طبع حضرت خواجہ	اور یہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو بہت
قطب الدین قدس سرہ بود[32]	مرغوب تھی[33] ۔

ملتانی دھناسری کے علاوہ حضرت بہاالدین زکریاؒ نے نٹ ہمیر اور ابہیر کو ملا کر گور راگ بنایا ، یہ راگ گجرات میں بہت مقبول ہے ۔ اسی طرح آپ نے

---

[30] ایضاً ۔ ص ۳۲ ۔

[31] سیف خان ، راگ درپن ، مخطوط علیگڑھ یونیورسٹی لائبریری ، ورق ۱۴ الف

[32] شاہنواز خان ، مرأت آفتاب نما ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری فارسی نمبر ۲۶ ، ورق ۲۹۴ الف

[33] عنایت خان راسخ ، رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان ، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۱ء ۔ ص ۴۰

رام کلی، سیام اور گندھار کو ملا کر گوجری راگ بنایا۔[۳۴] محمد اشفاق علی خان نے ملتانی راگ کی ایجاد بھی آپ ہی کی طرف منسوب کی ہے۔[۳۵] ان راگوں کے علاوہ آپ نے پوربا اور دھناسری کو ملا کر پوربا دھناسری راگ ایجاد کیا۔[۳۶] ماہرین موسیقی کے ان بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ اس فنِ لطیف میں مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔

ہمارے خیال میں موسیقی ایک لطیف فن تھا اور صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں موسیقی کو غذائے روح سمجھ کر سنا جاتا تھا۔ ایک ماہر موسیقار جناب شمس کنول اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "موسیقی فنونِ لطیفہ میں سے ایک بڑا لطیف فن ہے جس سے قلب انسانی پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، کبھی دل حسرت و الم میں ڈوب جاتا ہے اور کبھی اس میں جوش و سرور پیدا ہوتا ہے اور اس طرح انسان کے مختلف جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں، صوفیائے کرام اور سنت سادھوؤں کا طبقہ موسیقی کو تزکیہ نفس اور تصفیۂ باطن کا ذریعہ سمجھتا ہے"[۳۷] بڑے بڑے صوفیائے کرام نے موسیقی کی نوک پلک سنوارنے اور اسے بامِ عروج تک پہنچانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا ہے۔ اس ضمن میں مؤخر الذکر دونوں بزرگوں کے علاوہ امیر خسروؒ، صوفی بہاء الدین برناویؒ، صوفی شیر محمد، محمد غوث گوالیاریؒ۔ شیخ پیر میرٹھی، نظام الدین مدھ نایک،

---

[۳۴] محمد اشفاق علی خان، نغمات الہند، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، ص ۷۷

[۳۵] ایضاً۔ [۳۶] شاہنواز خان، مرأت آفتاب نما، ورق ۲۹۴ الف

[۳۷] شمس کنول، "علم موسیقی"، ماہنامہ آج کل دہلی، موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء، ص ۱۶

میراں سید شاہ حسینؒ اور حضرت سید شاہ جمالؒ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں ہماری یہ رائے ہے کہ موسیقی جب تک رنڈی کے کوٹھے تک نہیں پہنچی تھی اُس وقت تک اسے ایک پاکیزہ فن تصوّر کیا جاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے خدا رسیدہ درویشوں نے اسے پروان چڑھانے میں اپنی عمریں صرف کر دیں اور اسے اپنے لئے بالکل عار نہ سمجھا۔

عہد ہمایوں میں حضرت محمد غوث گوالیاریؒ کی خانقاہ موسیقاروں کا ملجا و ماویٰ تھی۔ تان سین کے والد مکرند پانڈے کو حضرت کے ساتھ بڑی عقیدت تھی، اسی بنا پر اس نے تان سین کو بچپن ہی میں حضرت کے پاس چھوڑ دیا تھا۔[۱۳۹] حضرت نے کمالِ شفقت سے اس کی پرورش کی اور ماہر اساتذہ کی نگرانی میں اُسے موسیقی کی تعلیم دلوائی۔ اور یہ حضرت ہی کا فیضانِ نظر تھا کہ تان سین ہندوستان کا موسیقارِ اعظم کہلایا اور ابوالفضل یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ گذشتہ ہزار سالوں میں اس کی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی۔[۱۴۰] تان سین کے علاوہ بیجو باورے کی تربیت میں بھی حضرت محمد غوث گوالیاریؒ کا بڑا ہاتھ ہے۔

راجہ مان سنگھ تنوار والیِ گوالیار کے درباری گویّے نائک بخشو کا انتقال ہو چکا تھا، البتہ اس کی بیٹی عہدِ ہمایوں میں بقیدِ حیات تھی۔ وہ فنِ موسیقی

---

[۱۳۸] ایضاً، ص ۸۷

[۱۳۹] پروفیسر محمد مسعود احمد نے تان سین کا شمار حضرت محمد غوثؒ کے مریدوں میں کیا ہے ملاحظہ ہو ان کی تالیف، شاہ محمد غوث گوالیاریؒ مطبوعہ میرپور خاص ۱۹۶۴ء، ص ۱۳۰

[۱۴۰] ابوالفضل، آئینِ اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء، ص ۲۲۳

میں اپنے باپ کی صحیح جانشین سمجھی جاتی تھی۔ اس کے ماہرِ فن ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کا موسیقارِ اعظم تان سین اس کا شاگرد تھا۔[41]

ہمایوں کے عہدِ حکومت میں بندرابن میں دریائے جمنا کے کنارے ایک خدارسیدہ ہندو بابا ہری داس رہتا تھا، اسے موسیقی پر مکمل دسترس حاصل تھی اور بڑے بڑے موسیقار اُسے اُستادِ فن تسلیم کرتے تھے۔ اس کے ماہرِ موسیقی ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا کہ اس کے تلامذہ میں تان سین کا نام بھی نظر آتا ہے۔[42]

موسیقی کی تاریخ میں ہمایوں کا دورِ حکومت اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے عہد میں ایران سے کئی نامور موسیقار ہندوستان آئے اور وہ اپنا طرزِ اسلوب بھی ساتھ لائے۔ شمالی ہندوستان کے موسیقاروں نے ان کے ساتھ مل کر ہندوستانی موسیقی کو ایرانی سانچے میں ڈھال کر جدید ہندوستانی موسیقی کی بنیاد رکھی۔ اور اسی بنیاد کو بعض ہندو موسیقاروں نے "ایک تاریخی اتفاق" کا نام دیا ہے۔[43]

ہمایوں کی ہندوستان سے جلاوطنی کے دوران اسلام شاہ سوری کے جانشین محمد عادل شاہ نے موسیقی کی شمع کو بجھنے سے بچا لیا۔ وہ موسیقی کا سرپرست ہونے کے علاوہ خود بھی بڑا اچھا گویا تھا اس نے اپنے پایۂ تخت

---

[41] محمد اسلم، شاہجہان کا ذوقِ موسیقی، مطبوعہ روزنامہ امروز، ۹ مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۷

[42] عطیہ بیگم فیضی، دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۲۳

[43] بی سبھامورتی، آج کل دہلی موسیقی نمبر، ص ۸۷

گوالیار میں راجہ مان سنگھ تنوار کی روایت کو زندہ رکھا اور گویوں کی تربیت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے ماہر موسیقی ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ سلطان باز بہادر[۱۴۴] اور تان سین جیسے موسیقاروں نے اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔

اکبر کا دربار تو موسیقی کا گہوارہ معلوم ہوتا تھا۔ ابوالفضل رقمطراز ہے کہ قبلہ عالم اس فن پر خاص توجہ فرماتے اور ہر موسیقی دان کے سرپرست و مربی ہیں۔ بیشمار ہندی، ایرانی، تورانی اور کشمیری نغمہ پرداز بارگاہ عالی میں جمع ہیں جن میں مرد و عورت دونوں داخل ہیں۔ جہاں پناہ نے درباری گویوں کو سات گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے اور ہر گروہ ہفتے میں ایک روز حاضر ہو کر اپنے کمالات دکھاتا اور سامعین کے قلوب کو کانوں کے ذریعے سے بادۂ معرفت کا متوالا بنا کر کسی کو مست اور کسی کو ہشیار کرتا۔[۱۴۵] ابوالفضل کے بیان کے مطابق چھتیس گویئے اور سازندے شاہی دربار میں ملازم تھے، ان میں سے گانے والوں میں میاں تان سین اور اس کا بیٹا تان ترنگ خان، سبحان خان اور اس کا بھائی بچہ خان، ملا اسحٰق اور اس کا بھائی رحمت اللہ، بابا رام داس اور اس کا بیٹا سور داس، سرود خان، داؤد، سرگیان خان، میاں چاند، محمد خان، میاں لال، چاند خان، نانک جارجو اور رنگ سین خاص طور پر مشہور ہیں، اسی طرح طنبورہ بجانے میں استاد محمد حسین، استاد یوسف،

---

[۱۴۴] نظام الدین احمد، طبقات اکبری، جلد ۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۲۵۲ "باز بہادر اپنے وقت میں ہندی موسیقی میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا اور اس کا زیادہ تر وقت رقاصوں اور مغنیوں کی صحبت میں ہی گذرتا تھا۔"

[۱۴۵] ابوالفضل، آئین اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۲۶۳

سلطان ہاشم اور اُستاد محمد امین، قانون بجانے میں میر عبداللہ، سارنگی بجانے میں میر سید علی اور بہرام قلی، سرمندل بجانے میں میر مندل خان، بنسری بجانے میں استاد دوست، مجاوُ بنانے میں پیرزادہ، حافظ خواجہ علی اور سلطان بیگ، بین بجانے میں صاحب خان اور بہ بین خان، سرنا بجانے میں اُستاد شاہ محمد، قنبر نوازی میں تاش بیگ اور کرنا پھونکنے میں شیخ دادن اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ قاسم نامی ایک موسیقار نے قنبر اور رباب کے درمیان ایک ساز ایجاد کیا تھا جسے وہ شاہی دربار میں بجایا جاتا تھا۔

”آئین اکھاڑہ“ کے تحت ابوالفضل رقمطراز ہے کہ اس آباد مملکت کے ذی عزت و ثروت افراد کے گھروں میں مجالسِ عیش منعقد کی جاتی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ اندرونی کنیزوں کو ساز و نغمہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور چار خوش رنگ عورتیں ناچتی ہیں اور عجیب اصول ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسری چار عورتیں نغمہ سرائی کرتی ہیں، ان میں سے دو پکھاوج بجاتی ہیں اور باقی دو اپنگ، اسی طرح ایک عورت رباب، دوسری ڈھولک، تیسری بین اور چوتھی چنر بجاتی ہے۔ اسی طرح دو عورتیں ہاتھوں میں چراغوں کے تھال لیکر ان کے اردگرد گھومتی رہتی ہیں۔[146]

اسی ضمن میں ابوالفضل رقمطراز ہے کہ قبلہ عالم کو سنگیت اور اس کے علاوہ دیگر امور میں بیشمار واقفیت حاصل ہے اور جو امور تمام عالم کے لئے کمال غفلت کا موجب ہو سکتے ہیں وہ گیتی خداوند کے لئے بیداری کا باعث ہیں۔[147]

---

[146] ایضاً، جلد ۲، ص ۲۲۶ [147] ایضاً۔

شاہی تقریبات اور جشنوں کے موقع پہ راگ و رنگ کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ابوالفضل رقمطراز ہے کہ ان موقعوں پہ ہر پہر کے آغاز پر نقارے بجائے جاتے تھے اور ارباب نشاط اپنی نغمہ سرائی اور ساز نوازی سے ہنگامۂ عیش برپا کر دیتے تھے[۴۸]۔ عہد اکبر کا شہرۂ آفاق مؤرخ ملّا نظام الدین احمد جشن نوروز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بادشاہ روز و شب میں دو بار اس جشن میں شرکت کرتا اور اس کے ساتھ ایرانی اور ہندوستانی گویے ہوتے تھے[۴۹]۔ طبقات اکبری کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جشن کے موقع پہ موسیقار پیش پیش ہوتے تھے۔ جشن نوروز پہ اکبر کا فرنگیوں سے "موسیقیٔ فرنگ" سن کر محظوظ ہونا بھی ثابت ہے[۵۰]۔

ہندوستانی، ایرانی اور کشمیری موسیقی کے علاوہ فرنگیوں کی آمد و رفت کے بعد اکبر نے "موسیقیٔ فرنگ" سننے کا ذوق بھی پیدا کر لیا تھا۔ عبدالقادر بدایونی رقمطراز ہے کہ حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے ارغنون[۵۱] نامی ایک باجا لایا جو عجائب مخلوقات میں شمار ہوتا ہے۔ بادشاہ نے یہ باجا اہل دربار کو دکھایا اور اسے سن کر بے حد محظوظ ہوا۔ یہ باجا ایک قد آدم صندوق

---

[۴۸] ایضاً، جلد اوّل، حصہ اوّل، ص ۴۱۱۔

[۴۹] ملّا نظام الدین احمد، طبقات اکبری، جلد ۲، ص ۲۵۵

[۵۰] محمد حسین آزاد، دربار اکبری، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۱۵۲

[۵۱] مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کے خیال میں جس ساز کو بدایونی ارغنون لکھتا ہے وہ پیانو ہے۔ تذکرہ مجدد الف ثانیؒ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ص ۵۵

تھا جس پر مور کے پر لگے ہوئے تھے۔ ایک فرنگی اس کے اندر بیٹھ کر اس کے تار ہلاتا اور دو فرنگی باہر بیٹھ کر موروں کے پروں کی جڑوں پر انگلیاں مارتے تھے۔ اللہ اللہ، اس میں سے کیسی کیسی روح پرور آوازیں نکلتی تھیں[۵۲]

موسیقی سن کر اکبر پر کیا گذرتی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۹۶۸ھ میں اکبر دارالحکومت سے شکار کے ارادہ سے نکلا۔ فتح پور سیکری کے قریب منڈاکر نام کے ایک گاؤں میں قوالی ہو رہی تھی اور قوال خواجہ غریب نوازؒ کی منقبت گا رہے تھے۔ قوالوں کی زبان سے خواجہؒ کی منقبت سن کر اکبر پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہیں سے اجمیر کی طرف باگ موڑ لی۔

اکبر کے ذوقِ موسیقی کے ضمن میں اس بات کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ تان سین کی صحبت میں رہ کر اکبر نے کلاسیکی موسیقی کا بڑا اعلیٰ ذوق پیدا کر لیا تھا۔ اکبر کے ذوق کے پیش نظر تان سین نے درباری کانہڑہ، دربار کلیان، درباری اساوری اور شہانہ جیسے راگ مرتب کئے[۵۳]۔ ڈاکٹر عبدالحلیم کی تحقیق کے مطابق میاں کی ملہار، میاں کی ٹوڈی اور میاں کی سارنگ بھی تان سین کے ہی مرتب کردہ راگ ہیں[۵۴]۔ خوش قسمتی سے تان سین کے مرتب کردہ راگوں کے مسودات رضا لائبریری رام پور میں

---

[۵۲] بدایونی، منتخب التواریخ، مطبوعہ نولکشور ۱۲۸۴ھ، ص ۲۳۴

[۵۳] محمد اشفاق علی خان، نغمات الہند، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، ص ۷۸۔

[۵۴] ڈاکٹر عبدالحلیم، الیسینز آف ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۲۹۔

محفوظ ہیں اور اینجل روز نتھال نے اپنی تصانیف میں ان سے پوری طرح فائدہ اُٹھایا۔[۵۵]

تان سین کے متعلق سید عابد علی عابد تحریر فرماتے ہیں کہ اس نے کلاسیکی سنگیت کو ایک نیا رس، نئی حلاوت اور نیا بانکپن بخشا۔ اس نے راگوں میں نہایت دلکش تصرفات کئے اور یہ راگ ان تصرفات کے ساتھ اب اُسی کے نام سے منسوب ہیں، مثلاً میاں کی ٹوڈی، میاں کی ملہار، لیکن جس راگ کی بدولت تان سین کا نام کلاسیکی سنگیت میں ہمیشہ زندہ رہے گا، وہ درباری ہے، جسے سن کر بقول اکبر کہا کرتا تھا کہ دل کی سوئی ہوئی تمنائیں جاگ اُٹھتی تھیں اور بڑے بڑے کام کرنے کے ولولے بیدار ہوتے تھے۔[۵۶]

درباری کے متعلق پروفیسر خادم محی الدین لکھتے ہیں کہ یہ اوّل شب گذر جانے اور آدھی رات شروع ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر گایا جاتا ہے جونہی اس کے دھیمے ابتدائی سُر۔ نی سا رے سا دھا، نی پا گانے۔ شروع کئے جائیں بس کر طبیعت میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ اس راگ کے سروں کے بیشتر حصے کا زور نیچے کے سپتک پر رہتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کا یہ مرغوب راگ تھا، امورِ سلطنت کے خرخشوں اور جھمیلوں میں دن بھر مصروف رہنے کے بعد شاہ کو امن اور سکون مطلوب تھا، اسی لئے تان سین یہ راگ پیش کرتا تھا۔[۵۷]

---

[۵۵] اینجل روز نتھال، دی سٹوری آف انڈین میوزک اینڈ اِٹس انسٹرومنٹس، مطبوعہ لندن ۱۹۲۸ء، ص ۸۰

[۵۶] سید عابد علی عابد، ماہنامہ تندمردان، موسیقی نمبر، مئی تا جون ۱۹۶۰ء، ص ۸۲ -

[۵۷] خادم محی الدین، بحوالہ ایضاً، ص ۱۰

ہندوستانی موسیقی کو پروان چڑھانے میں تان سین نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی وجہ سے اس کا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔ ابوالفضل نے، جو خود بھی موسیقی کا بڑا ماہر تھا، یونہی نہیں لکھ دیا تھا کہ گذشتہ ہزار سال میں اس جیسا گویا اس سرزمین میں پیدا نہیں ہوا جہانگیر نے اپنی تزک میں تان سین کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

تان سین کلاونت کہ در خدمت پدرم بے نظیر زمان خود بودہ بلکہ در ہیچ عہد و قرن مغنی مثل او نگذشتہ[۵۸]	تان سین کلاونت جو میرے والد کا ملازم تھا اپنے زمانے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ (اپنے زمانے کی تو بات ہی کیا) کسی زمانے میں بھی اس جیسا گویا پیدا نہیں ہوا۔

تان سین چونکہ مسلمان تھا اور اس نے ہندوستانی موسیقی میں کچھ تصرفات بھی کیے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ اس نے موسیقی کو ذریعہ معاش بنا لیا تھا، اس لئے ہندو اس سے خوش نہیں ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ تان سین ہندوؤں کی موسیقی کے زوال کا سبب بنا ہے[۵۹]۔

الناس علیٰ دین ملوکہم کے مصداق اکبر کے مصاحب اور حواری بھی موسیقی میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ عہدِ اکبر کے مشہور مورخ ملّا عبدالقادر بدایونی اکبر کے پیش امام تھے[۶۰] اس کے باوجود وہ موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے۔ محمد حسین آزاد بدایونی کے متعلق لکھتا ہے "ملا صاحب

---

[۵۸] تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۰۴

[۵۹] فاکس سٹرینگ ویز، دی میوزک آف ہندوستان۔ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۴ء، ص ۸۴۔

[۶۰] منتخب التواریخ، جلد ۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ص ۲۲۷

خود روکھے سوکھے عالم تھے مگر طبیعت ایسی شگفتہ و شاداب لائے تھے جو انشاء پردازی کی جان تھی، باوجود علم و فضل اور مشیخت فقر کے گاتے بجاتے تھے، بین پر بھی ہاتھ دوڑاتے تھے[61] بدایونی خود اپنے متعلق منتخب التواریخ میں رقمطراز ہے۔

وقوف در نغمہ ولایت و ہندی	میں ہندوستانی اور غیر ملکی نغموں سے
و خبری از شطرنج صغیر و کبیر دارد	بخوبی واقف ہوں، اس کے علاوہ
و مشق بین بقدری کردہ[62]	شطرنج کی چھوٹی بڑی بازی بھی لگا لیتا
	ہوں اور بین بجانا بھی جانتا ہوں۔

اس زمانے میں فنِ موسیقی کو بڑا پاکیزہ فن تصور کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ گانے بجانے کا شوق بدایونی کی امامت کے راستے میں حائل نہ تھا۔ بدایونی تو خیر پھر بھی پیش امام تھے، اکبر کے صدر الصدور شیخ گدائی کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی طبیعت موزوں تھی، ہندی گیت اور دوہروں کی لے آپ رکھتے تھے۔ قوالوں سے گواتے تھے اور آپ بھی گاتے تھے اور اس کے ذوق و شوق میں لٹو تھے اور دلواتے تھے[63]

شیخ گدائی کے والد شیخ جمالیؒ سلطان سکندر لودھی کے اُستاد اور بڑے نغز گو شاعر تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انہیں موسیقی سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ شیخ موصوف کی ایک غزل جس کے ابتدائی شعر درج ذیل

---

[61] محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۷ء، ص ۴۲۲

[62] منتخب التواریخ، جلد ۳، مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۶۹ء، ص ۳۰۴

[63] محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری، ص ۷۷۳

ہیں، عہدِ اکبر میں بڑے ذوق و شوق سے گائی جاتی تھی اور کہتے ہیں کہ انھوں نے خود ہندوستانی راگ میں اس کی لے رکھی تھی۔

طال شوقی الیٰ لقائکم　　ایها الغالبون من نظری
روز و شب مونسم خیال شما　　فاسئلوا عن خیالکم خبری[64]

شیخ مبارک ناگوری علوم شریعت کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی میں بھی کامل دسترس رکھتا تھا، بدایونی شیخ موصوف کی علمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "ملائی باین جامعیت بنظر نیامده[65]" شیخ کا ذوق موسیقی اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ:۔

یکدم بی استماع صوتی ولغتی وسرودی　　وہ آواز گانے، راگ اور ساز کے
ودسازی آرام نمی گرفت[66]　　بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا تھا۔

پروفیسر علم الدین سالک شیخ مبارک کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ اُسے موسیقی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، ایک دفعہ اکبر سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی، بادشاہ نے کہا کہ اس فنِ لطیف کے سلسلے میں ہم سے جو سامان بہم پہنچا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ہے، کسی دن ہم دکھائیں گے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد شیخ منجھو، میاں تان سین اور دیگر کلاونتوں کو بلا بھیجا اور انہیں کہا کہ وہ شیخ کے گھر جاکر اپنے کمال فن کا مظاہرہ کریں۔ شیخ نے سب سے سنا، آخر میں میاں تان سین سے مخاطب

---

[64] ایضاً، ص ۷۱۱

[65] بدایونی، منتخب التواریخ، جلد ۳، مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۶۹ء، ص ۷۴

[66] ایضاً، ص ۷۳

ہوئے اور کہا: "شنیدم تو ہم چیزے میتوانی گفت"۔ اس پر میاں تان سین نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا، جسے سن کر آپ نے کہا: "ہاں کچھ جانوروں کی طرح بولیاں بول لیتے ہو"[۶۷]۔ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مبارک کا ذوقِ موسیقی اتنا بلند تھا کہ وہ بڑے سے بڑے گویے کو خاطر میں نہ لاتے تھے، وہی تان سین جس کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے کہ گذشتہ ہزار برس میں اس سرزمین میں اس جیسا کوئی گویّا پیدا نہیں ہوا، اس کے متعلق ابوالفضل کے والد کہتے تھے کہ وہ جانوروں کی طرح کچھ بھائیں بھائیں کر لیتا ہے۔

شیخ مبارک کے ذوقِ موسیقی سے اس کے بیٹوں کو بھی وافر حصّہ ملا تھا، چنانچہ فیضی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ موسیقی کا ماہر تھا۔[۶۸] شیخ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں جس طرح موسیقی کے زیر و بم پر بحث کی ہے وہ خود اس کے ماہرِ فن ہونے کی دلیل ہے۔

اکبر کے اتالیق بیرم خان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ موسیقی کا بڑا دلدادہ اور موسیقاروں کا سرپرست تھا۔ اس کا ایک واقعہ محمد حسین آزاد نے دربارِ اکبری میں نقل کیا ہے۔ آزاد لکھتا ہے کہ "رام داس لکھنوی، سلیم شاہی زمانہ کا گویّا تھا کہ موسیقی میں دوسرا تان سین کہلاتا تھا۔ وہ اس کے دربار میں آیا اور گایا۔ خزانہ میں اس وقت کچھ نہ تھا، اس پر لاکھ

---

[۶۷] پروفیسر علم الدین سالک، نقوش لاہور نمبر ۱۹۶۲ء، ص ۴۶۸، ۴۶۷۔ بدایونی نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۲۶۵

[۶۸] شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد ۳، مطبوعہ ظفر بکڈپو، لاہور، ص ۱۴۱۔

روپیہ دیا۔ اس کا گانا بہت پسند تھا۔ چنانچہ خلوت و جلوت میں محرم اور ہمدم تھا۔ جب وہ گاتا تھا خانخانان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ ایک جلسہ میں نقد جنس جو اسباب موجود تھا سب دے دیا اور آپ الگ اُٹھ گیا[۹۶]۔ بیرم خان کے فرزند عبدالرحیم خانخانان کو اس فنِ لطیف کے ساتھ جو مناسبت تھی اس کے ذکر کے لئے ایک الگ دفتر درکار ہے۔ جس کی اس مضمون میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

عہدِ اکبر کے موسیقاروں میں سورداس اور تلسی داس کا بھی بہت اونچا مقام ہے، ان کا چونکہ دربار سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے فارسی تذکروں اور تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں آیا۔ یہ دونوں تارک الدنیا سادھو سنت تھے اس لئے ہندوؤں کی روایات میں ان کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ آیا ہے، بلکہ ہندو تو ان کے سامنے تان سین کو بھی طفلِ مکتب ہی سمجھتے ہیں۔ اسی ضمن میں چتوڑ کی شہزادی میرابائی کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ میرابائی رانا سانگا کے ولی عہد کی دھرم پتنی تھی، لیکن عین نوجوانی کے عالم میں بیوہ ہوگئی۔ میرابائی نے دُنیاوی لذات سے مُنہ موڑ کر ایشور کے ساتھ لو لگالی اور فقیرانہ بھیس میں راجستھان کے قریہ قریہ میں گھومنے لگی۔ وہ بڑی اچھی شاعرہ تھی اور اس پہ طرہ یہ کہ موسیقی کا ذوق بھی کماحقہ پایا تھا۔ اس پہ خاوند کی موت کا صدمہ مستزاد تھا۔ ان سب عوامل نے مل کر اُسے بڑی اچھی گلوکارہ بنا دیا۔ میرابائی کے بھجن آج تک گائے جاتے ہیں اور وہ ہندی لٹریچر کا بہترین سرمایہ ہونے کے علاوہ فنِ موسیقی

---

[۹۶] محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۱۹۴

کا بھی بیش بہا سرمایہ ہیں۔ عطیہ بیگم فیضی نے میرا بائی کی بحیثیت موسیقار بڑی تعریف کی ہے[۷۰]

اکبر کے عہد میں گوالیار اور بلگرام موسیقی کے مرکز مانے جاتے تھے۔ اکبر کے دربار کے اٹھارہ گوّیوں میں سے گیارہ گوالیار کے رہنے والے تھے[۷۱] ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ مان سنگھ تنوار نے گوالیار میں ایک میوزک اکیڈمی قائم کی تھی، جہاں سے بڑے بڑے گوّیے تربیت پا کر نکلے۔ مان سنگھ کے بعد محمد عادل شاہ اور پھر حضرت محمد غوث گوالیاری نے اس کی روایات کو برقرار رکھا، وہ دن اور آج کا دن، گوالیار دنیا موسیقی کی راجدھانی سمجھا جاتا ہے۔ بلگرام کے متعلق ابوالفضل رقمطراز ہے کہ وہاں کے باشندے اپنی فہم و فراست میں مشہور اور موسیقی کے دلدادہ ہیں[۷۲]

جہانگیر بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کی سرپرستی کرتا رہا۔ اس کے دربار میں اُستاد محمد نائی، شوقی طنبورہ نواز، باتیا، جہانگیر داد، چتر خان، حافظ عبداللہ، حافظ نادعلی، نصیرا، حافظ چیلہ، حافظ کیب ننھا، رحیم داد خان، پرویز داد، خرم داد، ماکھو اور حمزہ جیسے نادر روزگار ماہرین موسیقی موجود تھے۔ ان میں سے اکثر کے کمالِ فن کا اعتراف اس نے اپنی تزک میں کیا ہے۔ جہانگیر اُستاد محمد نائی کا بڑا قدردان تھا۔ ایک موقع پر

---

[۷۰] دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۲۳

[۷۱] ٹی۔ ڈبلیو ہیگ، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مطبوعہ لیڈن، آرٹیکل "تان سین"

[۷۲] آئین اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء، ص ۴۳۲

وہ اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

استاد محمد نائی را کہ در فنِ خود از بے نظیران بود، فرزند خرم بموجب طلب فرستادہ بود، چند مجلس سازش شنیدہ شد و نقشی کہ در غزل بنامِ من بستہ بود گذرانید، در دوازدہم ماہ مذکور فرمودم کہ او را بروپیہ وزن نمودند شش ہزار و سیصد روپیہ و فیل حوضہ داری نیز باو عنایت نمودہ، مقرر فرمودم کہ برآن فیل سوار شدہ و زرہا بر اطراف و جوانب خود چیدہ و پاشیدہ بمنزل خود برد[43]

اُستاد محمد نے نواز کو، جو اپنے فن میں یکتا تھا، میرے کہنے پر خرم نے میرے پاس بھیج دیا۔ چند مجلسوں میں میں نے اُس سے ساز سنا اور اس نے جس غزل کی لے میرے نام سے تیار کی تھی، اس کا بھی مظاہرہ کیا۔ ماہ مذکور کی بارہ تاریخ کو میں نے حکم دیا کہ اسے روپوں کے برابر تولا جائے۔ چھ ہزار تین سو روپے اور ایک ہاتھی معہ ہودج اُسے عنایت کیا۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ وہ اس ہاتھی پر سوار ہو کر اپنے گھر جائے اور راستے میں دونوں طرف رُپے پیسے برساتا جائے۔

اکبر نے بھی بڑی دریا دلی کے ساتھ موسیقاروں کی سرپرستی کی تھی، لیکن جس انداز سے جہانگیر نے ایک نے نواز کو نوازا تھا اس کی مثال عہدِ اکبر میں دیکھنے میں نہیں آتی۔ جہانگیر شوقی طنبورہ نواز کے کمالِ فن کا بھی بڑا معترف تھا، اس نے اپنی تزک میں اسے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

شوقی طنبورہ نواز را کہ از نادر ہائے

شوقی طنبورہ نواز کو، جو زمانے بھر میں

---

[43] تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۱۸۶

روزگار است و نغمات ہندی وپارسی
رابروشی مینوازد کہ زنگ از دلہا
زداید، بخطاب آنند خانی دلخوش
ومسرور ساختم، آنند بزبان ہندی خوشی
وراحت رامی گویند[74]

اپنے فن میں یکتا ہونے کے علاوہ ہندوستانی
اور ایرانی نغمات اس انداز سے گاتا ہے
کہ انہیں سن کر دلوں کا زنگ اتر جاتا ہے
میں نے آنند خان کا خطاب دے کر خوش
اور مسرور کیا۔ ہندی زبان میں آنند خوشی
اور راحت کو کہتے ہیں۔

معتمد خان نے اقبال نامہ جہانگیری میں دربار جہانگیر کے تیرہ سو موسیقاروں کا ذکر کیا ہے جو اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے[75]۔ جہانگیر کے درباری موسیقاروں میں رحیم داد خان کا بڑا اونچا مقام تھا، وہ ملونڈی کا رہنے والا اور اپنے فن کا امام مانا جاتا تھا۔ جہانگیر کے حکم سے اس نے شہزادوں کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کردایا تھا[76]۔

اکبر کے عہد میں یعقوب نام کا ایک عیسائی تاجر حلب سے بسلسلۂ تجارت آگرہ آیا۔ وہ کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ پرتگیزوں کے ساتھ مذہبی مذاکرات کے سلسلہ میں اکبر کو فارسی اور پرتگیزی زبانیں جاننے والے مترجم کی ضرورت تھی، چنانچہ اکبر نے یعقوب کو ملازم رکھ لیا، روایت ہے کہ یعقوب نے دینِ الٰہی قبول کر لیا تھا۔ یعقوب کی وفات کے بعد اکبر نے اس کے نوعمر بیٹوں ذوالقرنین اور سکندر کی تربیت اپنی نگرانی میں کی اور اول الذکر کو

---

[74] ایضاً۔ ص ۱۶۲

[75] اقبال نامہ جہانگیری، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ص ۳۰۸

[76] آغا صادق، ماہنامہ قند مردان، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۶۰ء، ص ۶۱

موسیقی کی تعلیم دلائی۔ ذوالقرنین کو موسیقی پر مکمل دسترس حاصل تھی اور وہ جہانگیر اور بعد ازاں شاہجہان کے دربار میں اساتذۂ فن کی موجودگی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔[۷۷] شاہنواز خان نے بھی ذوالقرنین کو بحیثیت موسیقار خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

عہدِ جہانگیر میں ٹھٹھہ کا گورنر علیٰ خان ترخان بھی موسیقی کا بڑا اونچا ذوق رکھتا تھا۔ شاہنواز خان اس کے متعلق لکھتا ہے۔

دل دادہ راگ و رنگ بود، و در نغمہ	وہ راگ رنگ کا دلدادہ تھا، راگ
خوانی و ساز نوازی خالی از کمال	گانے اور ساز بجانے میں بھی بڑا کمال
نبود[۷۹]	رکھتا تھا۔

عہدِ اکبر کی طرح عہدِ جہانگیر میں بھی شاہی تقریبات اور جشنوں کے موقع پر گویئے اور سازندے پیش پیش ہوتے تھے۔ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد جب پہلا نوروز منایا تو نوروز کی تقریبات میں اہلِ ساز و نغمہ نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔[۸۰] جہانگیر نے اپنی تزک میں گیارھویں سال جلوس میں نوروز کے موقعہ پر حافظ نادعلی کو انعام دینے کا ذکر کیا ہے۔[۸۱]

---

[۷۷] ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسینز آف ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۲۱، ۲۲

[۷۸] مرأت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۶ ب۔

[۷۹] شاہنواز خان، مآثر الامرا، جلد ۳، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۴۹۲

[۸۰] تزکِ جہانگیری، سر سید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۲

[۸۱] ایضاً، ص ۱۵۵

سولھویں سال جلوس میں جب جہانگیر طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوا تو نور جہاں نے اس خوشی میں ایک جشن آراستہ کیا جس میں اہلِ نشاط موجود تھے[۸۲]

جہانگیر قوالی کا بھی دلدادہ تھا اور اس کی مجلس سماع میں صوفیان باصفا کو وجد آجاتا تھا۔ ایک بار دہلی کے قوال اس کے حضور میں قوالی پیش کر رہے تھے اور جب انھوں نے امیر خسروؒ کا یہ شعر پڑھا۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

تو ملا علی احمد مہر کن کو وجد آگیا۔ انھوں نے بھی اپنی ٹوپی ذرا ترچھی کر لی اور تڑپ کر زمین پر گرے۔ جہانگیر نے لپک کر ان کا سر اٹھایا تو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔[۸۳]

بادی النظر میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے مرنے کے ساتھ ہی موسیقی کو زوال آگیا تھا اور شاہجہان کی قدر دانیوں کی بدولت اسے دوبارہ عروج ہوا لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جن گویوں نے شاہجہان کے عہد میں نام پایا ان کی تربیت جہانگیر کے عہد میں ہوئی تھی۔ اس لیے جہانگیر کے دور کو فن موسیقی کے زوال کا دور نہیں کہا جا سکتا۔ اب رہا یہ اعتراض کہ جہانگیر کا دور اگر موسیقی کے زوال کا دور نہیں تھا تو پھر اس عہد کے تذکروں میں موسیقاروں کا ذکر زیادہ کیوں نہیں ملتا۔

---

[۸۲] ایضاً۔ ص ۳۲۵۔

[۸۳] ایضاً۔ ص ۸۲۔

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اکبر کے ساتھ اس کے درباری گویئے تو نہیں مر گئے تھے، اس لئے جن گویّوں کا ذکر اکبر کے عہد کی تاریخوں اور تذکروں میں آچکا تھا، اُسے عہدِ جہانگیری میں دہرانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اسی طرح جو گویئے عہدِ جہانگیر میں ابھی مبتدی تھے اور اُنھوں نے عہدِ شاہجہان میں شہرت پائی، ان کا ذکر عہدِ شاہجہان میں لکھی جانے والی تاریخوں میں آیا ہے۔

شاہجہان اپنے آباؤ اجداد کے تمام اوصافِ حمیدہ سے متصف تھا اور اس کے دل میں علمی ذوق ہر وقت موجزن رہتا تھا، لیکن اس کا حسنِ ذوقِ علم و ادب بانزک نویسی کی بجائے جامع مسجد دہلی کی ندرت اور نفاست میں ظاہر ہوا۔ ایک ماہرِ فن کے بقول اس نے محبت کا نغمہ شعر و شاعری میں نہیں بلکہ تاج محل میں منظوم کیا۔ اس کے تمام ہم عصر مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ اس نے زندگی بھر نماز باجماعت اور تہجد قضا نہیں کی، لیکن اس علم و فضل اور نیکی و تقویٰ کے باوجود وہ فنِ موسیقی کی سرپرستی میں اپنے باپ اور دادا سے بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔

سرجدوناتھ سرکار اپنی تصنیف "سٹڈیز ان مغل انڈیا" میں رقمطراز ہے کہ شاہجہان کی اپنی آواز بڑی سریلی تھی اور خدا تعالیٰ نے اُسے لحنِ داؤدی عطا کیا تھا، جب وہ بات کرتا تو سننے والے بت بن جاتے تھے[۴۴]۔ اسی ضمن میں مؤرخ شہیر البشوری پرشاد لکھتا ہے کہ بادشاہ نے خود کئی ہندی راگ ایجاد کئے تھے، جو اس قدر مدہوش کن اور دلکش تھے کہ سماع کی

---

[۴۴] سرجدوناتھ سرکار، سٹڈیز انِ مغل انڈیا، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۹ء، ص ۱۳

محفلوں میں صوفیائے باصفا انہیں سن کر گھنٹوں وجد کے عالم میں رہتے تھے۔[۵۵]

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں "قواعد السلطنت شاہجہان" نام کی ایک کتاب موجود ہے جو بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فتح الملک بہادر کے کتب خانہ میں رہ چکی ہے۔ اس کا مصنف لکھتا ہے کہ شہنشاہِ معظم کو ایرانی، کشمیری اور ہندوستانی راگ راگنیوں سے خاص لگاؤ تھا اور وہ بسا اوقات نصف شب تک ان سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔[۵۶] سر جدوناتھ سرکار کی تحقیق کے مطابق شاہ جہان رات کے ساڑھے آٹھ بجے حرم میں چلا جاتا اور وہاں دو تین گھنٹے تک موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔[۵۷] عہدِ حاضر میں شاہجہان کا مشہور سوانح نگار بنارسی پرشاد سکسینہ لکھتا ہے کہ بادشاہ سلامت امورِ سلطنت سے فارغ ہو کر تکان دور کرنے کے لئے غروبِ آفتاب سے قبل موسیقی سے محظوظ ہوا کرتے تھے اور معمول کے مطابق رات کو سونے سے پہلے بھی سماع سنتے تھے۔ رانیوں کی محفلوں میں عام طور پر گانے بجانے پر کنیزیں مامور تھیں۔ اس کے علاوہ شاہی دربار میں بھی خاص جشنوں کے موقع پر راگ رنگ کا پروگرام پیش کیا جاتا تھا، جس میں اساتذۂ فن حصہ لیتے تھے۔[۵۸]

اسی ضمن میں شاہجہان کا ایک ہم عصر مؤرخ امین قزوینی رقمطراز ہے کہ

---

[۵۵] ایشوری پرشاد، اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول اِن انڈیا، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۳۶ء، ص ۶۶

[۵۶] قواعد السلطنت شاہجہان، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۱۴ ب

[۵۷] سٹڈیز اِن مغل انڈیا، ص ۱۳

[۵۸] بنارسی پرشاد سکسینہ، ہسٹری آف شاہجہان آف دہلی، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۶۲ء، ص ۳۳۷

بادشاہ اکثر اوقات ساز و نغمہ سے جی بہلاتا ہے۔ اُسے ہندی نغمات کے ساتھ ایک خصوصی لگاؤ ہے اور جو اس فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہیں موسیقی سے زیادہ اور کسی چیز میں لذت محسوس نہیں ہوتی۔ ہندوستانی موسیقی پر بادشاہ کی بڑی گہری نظر ہے اور اس کے علاوہ ایرانی اور غیر ملکی موسیقی سے وہ بڑی حد تک واقف ہے۔ اس ضمن میں اس بات کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ دوسرے ممالک کے لوگ نغمہ و لحن پر زیادہ زور دیتے ہیں لیکن ہندوستانی نزاکت اور معانی کے قدردان ہیں۔ بادشاہ عموماً نماز مغرب کے بعد موسیقی سنتا ہے۔ اور مجلس موسیقی برخاست کر کے نماز عشاء باجماعت ادا کرتا ہے۔[۸۹]

نائک بخشو کو فوت ہوئے ایک زمانہ گزر چکا تھا لیکن شاہجہان کو اس کے کمالِ فن کا اعتراف تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں وقت گزرنے کے ساتھ اس نادرِ روزگار موسیقار کا فن بھی ختم نہ ہو جائے۔ شاہجہان نے ماہرینِ فن کو مامور کیا کہ وہ بخشو کے گائے ہوئے دھرپد راگ جمع کریں۔ انھوں نے شب و روز کی محنت شاقہ کے بعد "ہزار دھرپد نائک بخشو" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ حسنِ اتفاق سے یہ کتاب زمانہ کی دست برد سے بچ کر بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے۔[۹۰] شاہجہان کے عہد کے اکثر گویوں کا مدار بخشو کی تصانیف پر تھا۔

---

[۸۹] قزوینی، پادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۱۷۲ ب

[۹۰] زخاؤ اینڈ ایتھے، فہرست مخطوطات فارسیہ و ترکیہ وغیرہ، جلد اوّل مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۸۹ء، مخطوطہ فارسی ۱۸۴۶

اس حقیقت کا اعتراف شاہجہان کے درباری مؤرخ عبدالحمید لاہوری نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

امروز مدار خنیاگران ہندوستان بہشت نشان بر تصانیف بخشو و تصانیف اوست[91]	آج کل ہندوستان بہشت نشان کے گویوں کا دار و مدار نائک بخشو اور اس کی تصانیف پر ہے۔

بادشاہنامہ میں قزوینی نے بھی بخشو نائک کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس دور میں بخشو کی طرز خاص و عام میں مقبول ہے تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اس جیسی — صورت و صدا و حسن و ادا کے ساتھ کوئی نہیں گا سکتا[92]۔ اس بات کا اعتراف عبدالحمید لاہوری نے بھی کیا ہے کہ عہدِ شاہجہان میں بخشو جیسی ٹیپ دوسرے نغمہ سرا ادا نہیں کر سکتے[93]۔

شاہجہان کے ذوق موسیقی کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ لال قلعہ کے نوبت خانہ میں گویئے موجود رہتے تھے جو دن کے پہروں کو راگوں اور راگنیوں کے ذریعے بتایا کرتے تھے۔ شاہجہان کے عہدِ حکومت میں شادی بیاہ کی تقریبات اور درباری جشن بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوتے تھے۔ بادشاہ کی تخت نشینی کی سالگرہ، جشن نوروز، جشن وزن قمری جشن وزن شمسی کے موقعوں پر جو تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں ان میں موسیقی کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ پیش کیے جاتے تھے۔

---

[91] عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۷۔

[92] محمد امین قزوینی، بادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۳۲۳ ب

[93] بادشاہنامہ، جلد ۲، ص ۶۔

محمد صالح کنبوہ سنہ ۱۰۴۲ھ کے واقعات کے ضمن میں رقمطراز ہے کہ جب شہزادہ دارا شکوہ کا عقد شہزادہ پرویز کی بیٹی نادرہ بیگم سے ہوا تو اس موقع پر "مطربان ہفت کشور" موجود تھے اور انھوں نے اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا۔[94] اس جشن کی تفصیل ذرا قزوینی کی زبانی سنئے۔

جشنے عظیم بود و آواز خوش و آہنگ دلکش مطربان و خنیاگران ہوش از سرِ ناہید می ربود[95]	یہ بڑا عظیم جشن تھا۔ سازندوں اور گویوں کی دلکش اور سریلی آواز نے ناہید ستارے کے بھی ہوش اڑا دیے تھے۔

دارا شکوہ کے عقد کے چند روز بعد ہی شہزادہ شجاع کی شادی رستم میرزا صفوی کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تو اس موقعہ پر آتشبازی کا بہترین مظاہرہ ہوا اور مشہور و معروف گویوں نے موسیقی کا رنگارنگ پروگرام پیش کیا۔[96] لطف کی بات یہ ہے کہ جب ۱۰۴۶ھ میں شاہجہان نے اپنے ولی صفت بیٹے اورنگ زیبؒ کا عقد شاہنواز خان کی بیٹی دلرس بانو سے کیا تو اس تقریب پر موسیقاروں نے موسیقی کا ایسا عمدہ پروگرام پیش کیا کہ بقول عبدالحمید لاہوری آسمان والوں نے کئی روز تک زمین سے سوائے نغمات کے اور کوئی آواز نہیں سنی۔[97]

---

[94] شاہجہان نامہ، جلد اوّل، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۴۰۶۔

[95] بادشاہ نامہ، ورق ۲۶۴ الف [96] شاہجہان نامہ، جلد دوم، ص ۴۱۳

[97] بادشاہنامہ، جلد دوم، ص ۲۶۸ ؛ "از نغمہ و ساز مطربان سحر پرداز عیش و طرب را روز بازاری و سرور و انبساط را سروکاری دیگر شد، بگوش آسمانیان جز صدای کامرانی نمی رسید و سامعۂ زمینیان جز آوای شادمانی نمی شنید"

۱۶۴۴ء میں جب شہزادی جہاں آرا نے غسل صحت کیا تو اس خوشی میں ایک شاہانہ جشن منایا گیا جس پر بلا مبالغہ لاکھوں روپیہ صرف ہوا، اس موقعہ پر تمام شعراء اور موسیقاروں کو خلعت عطا کئے گئے اور نقد انعام سے بھی نوازا گیا۔ عبدالحمید لاہوری نے خصوصیت کے ساتھ لعل خان کلاونت اور اس کے بیٹوں کا ذکر کیا ہے جنہیں دو ہزار روپے مرحمت ہوئے تھے [۹۸]۔

شاہجہان کے عہد میں دکن، کرناٹک، تلونڈی اور گوالیار موسیقی کے بڑے مرکز تسلیم کئے جاتے تھے، اکبر کے دربار کے اکثر و بیشتر گویئے گوالیار سے ہی آئے تھے، شاہجہان کے درباری گویوں کی اکثریت بھی گوالیار ہی کی رہنے والی تھی۔ اودھ میں بلگرام موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بلگرام کے باشندے اپنی فہم و فراست میں مشہور اور موسیقی کے دلدادہ ہیں [۹۹]۔ مشرقی پنجاب میں تلونڈی موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور اس قصبہ کی خاک سے بڑے بڑے ماہرین فن پیدا ہوئے جنہوں نے موسیقی کی نوک پلک سنوارنے اور اسے عروج پر پہنچانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ رحیم داد خان جس نے جہانگیر کے حکم سے شہزادوں کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کروایا تھا، تلونڈی ہی کا رہنے والا تھا [۱۰۰]

---

[۹۸] ایضاً، ص ۴۰۰

[۹۹] آئین اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء، ص ۴۳۲

[۱۰۰] آغا صادق، ماہنامہ قند مردان، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۶۳ء، ص ۶۱

سیف خان رقمطراز ہے کہ شاہجہان کی تخت نشینی کے بعد ہی قلمرو موسیقی کی تخت گاہ گوالیار سے بہت سے فن کار شاہی دربار میں چلے آئے اور ان میں سے اکثر فنکار موسیقی کی جدید دھنوں اور گوالیار کی نئی بندشوں اور ترکیبوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس طرح مغلوں کے دربار میں ایرانی موسیقی کے ساتھ ہندوستانی موسیقی بھی جگہ حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گئی۔ اکبر کے زمانہ اقتدار میں ہی ہندوستانی موسیقی کو کافی اونچا مقام مل گیا تھا۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کے اختلاط سے ایک نیا فن پیدا ہو رہا تھا جس میں ایرانی ترکیبوں اور ہندوستانی بندشوں نے مل کر دلکشی پیدا کر دی تھی۔ شاہجہان نے کشمیری دھنیں بھی اس میں شامل کر کے ایک نیا مکتب موسیقی قائم کیا۔[101]

الناس علیٰ دین ملوکھم کے مصداق شاہجہان کی دیکھا دیکھی اس کے درباری امراء بھی موسیقی میں دلچسپی لینے لگے۔ صاحبِ مآثر الامراء شاہنواز خان صفوی کے متعلق لکھتا ہے :-

ہم دلِ دادۂ راگ ونغمہ، خوانندہ و سازندہ، کہ نزد او فراہم آمدہ بودند درہیچ سرکارے در آنوقت نبود۔[102]	وہ راگ ونغمہ کا دلدادہ تھا، اور جتنے گوئیے اور سازندے اس نے اپنے ہاں جمع کئے تھے، اتنے اس زمانے میں کسی دوسرے کے پاس نہ تھے۔

اسی تذکرہ نویس نے شاہجہان کے ایک درباری امیر حسام الدین خان

---

[101] محمد اسلم، شاہجہان کا ذوق موسیقی، امروز سنڈے ایڈیشن ۹۔ مارچ ۱۹۶۸ء، ص ۷۔

[102] شاہنواز خان، مآثر الامراء، جلد دوم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۰ء، ص ۶۷۵۔

کے سوانح حیات مرتب کرتے وقت اس بات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

در فن موسیقی بسیار ماہر، خوش محاورہ، بدیہہ گوئی سخندان بود۔[103]	وہ فن موسیقی میں مہارت رکھنے کے علاوہ اپنی خوش کلامی اور حاضر جوابی کے لئے بھی مشہور تھے۔

یہی تذکرہ نگار زین خان کوکہ کے فرزند مغل خان کے متعلق لکھتا ہے۔

شکار دوست بود و بنغمہ و سرود شیفتگی داشت، سازندہ و نوازندہ بسیار فراہم آورد۔[104]	وہ شکار کے علاوہ نغمہ و سرود کا بھی بڑا دلدادہ تھا اور اس نے بہت سے گویے اور سازندے جمع کر لئے تھے۔

بدھ سنگھ ہاڈہ راجہ بوندی کا فرزند شاہزادہ مکرم معظم کا مصاحب تھا اور وہ کابل میں رہتا تھا۔ اس کے متعلق شاہ نواز خان رقمطراز ہے۔

در اقسام نغمہ قدرت تمام داشت[105]	وہ نغمہ کی مختلف اقسام پر کمال دسترس رکھتا تھا۔

شاہجہان کے درباری امراء میں ذوالقرنین فرنگی بھی اپنے ذوق موسیقی کی وجہ سے بڑا مشہور تھا۔ اس کا ذکر اس مضمون میں جہانگیر کے عہد میں ہو چکا ہے۔

راجہ روز افزوں کا بیٹا عیدے سنگھ بھی موسیقی کا بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔

---

[103] ایضاً، جلد اول، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۸ء، ص ۵۸۶

[104] ایضاً، جلد سوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۴۹۲

[105] مرآت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۶ ب

شاہجہان نے اُسے دولت افزوں کا خطاب عطا کیا تھا۔ اساتذۂ موسیقی کا یہ کہنا ہے کہ وہ امیر خسروؒ اور سلطان حسین شرقی کے علم و فن میں بڑی دسترس رکھتا اور خیال و ترانہ خوب گاتا تھا[106]۔

شاہجہان کے درباری اُمراء میں سیف خان بلاشبہ سب سے بڑا موسیقی دان تھا اور اُس نے اس فن پر۔ راگ درپن ۔ کے نام سے ایک قابلِ قدر کتاب بھی تالیف کی ہے۔ یہ کتاب بدقسمتی سے ابھی تک زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی تاہم اس کے مخطوطے پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں اور ان میں سے اوّل الذکر تینوں مخطوطے راقم السطور کی نظر سے گذر چکے ہیں۔ یہ وہی سیف خان ہے جس کے متعلق ناصر علی سرہندی نے کہا تھا۔

گفتگوئے طوطی از آئینہ می خیزد علے
گر نباشد سیف خان مارا نفس در کار نیست[107]

اسی سیف خان کے متعلق شاہنواز خان لکھتا ہے۔

ہموارہ درحضور پادشاہی دولت بار	وہ ہر وقت بادشاہ کے حضور میں رہتا تھا
می افروخت و بدوام روشناسی خود	اور اسی حضور دوام کی وجہ سے انعام و اکرام
را درخور نوازش می ساخت[108]۔	سے سرفراز ہوتا رہتا تھا۔

---

[106] محمد اکرم امام خان، معدن موسیقی، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۵ء، ص ۲۸۔
سیف خان نے اس کا نام عدیل سنگھ لکھا ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے (راگ درپن ورق ۱۴۷ب)

[107] دیوان ناصر علی سرہندی، مطبوعہ نظامی پریس دہلی ۱۲۹۲ھ، ص ۲۲۔

[108] مآثر الامرأ، جلد ۲، ص ۲۸۰

ایک دوسرے موقع پر شاہ نواز خان نے اس کے کمالِ فن کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :۔

در فن راگ و نغمہ بسیار ماہر بود[۱۱۰]	وہ راگ و نغمہ کے فن میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔

اس کی تالیف ۔ راگ درپن ۔ بذاتِ خود سیف خان کے ماہرِ موسیقی ہونے پر دال ہے ۔

شاہی دربار کے علاوہ صوفیائے کرام کی خانقاہیں بھی اس دور میں موسیقی کا گہوارہ بن گئی تھیں ۔ عہدِ شاہجہان میں نادریہ سلسلہ کی ترویج کے ساتھ سماع کو بھی فروغ ہوا اور اس سلسلہ کے بزرگوں نے دل کھول کر گویوں کی سرپرستی کی ۔ قادری بزرگوں کے علاوہ شطاریہ سلسلہ کے درویشوں نے بھی موسیقی کی ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ۔ اس جگہ ایک شطاری بزرگ شیخ پیر کا ذکر بیجا نہ ہوگا جو عہدِ شاہجہان میں میرٹھ میں رہتے تھے ۔ انہیں قدرت نے ذوقِ موسیقی ودیعت کیا تھا ۔ اور ان کی خانقاہ میں ہر وقت شعر و نغمہ کی محفل جمی رہتی تھی ۔ شاید اسی سبب سے ان کے ہم عصر انہیں ۔ سببِ رونقِ اربابِ غنا ۔ کہتے تھے ۔ طبقات[۱۱۱] شاہجہانی کا مؤلف ان کے متعلق رقمطراز ہے ۔

بوجد و سماع میلانِ خاطر عظیم داشت	وجد و سماع کی طرف ان کا میلان بہت
و نقشہائے ہندی می بست و شعرہائے	زیادہ تھا اور وہ خود بھی ہندی راگ
بزرگان خود می کردہ و مجلس ہا عالی برپا	ترتیب دیا کرتے تھے ۔ وہ اپنے بزرگوں کے

---

[۱۱۰] ایضاً ، ص ۴۸۴

[۱۱۱] محمد صادق ، طبقات شاہجہانی ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن ، اورئنٹل ۱۶۷۳ ، ورق ۳۱۲ ب

نمود نقشہائے وی تا بہ عجب   عرس مناتے اور اس موقع پر بڑی بڑی مجالس
وارد بہ[111]   منعقد کرتے۔ ان کے مرتب کردہ راگوں میں ایک
عجیب اثر ہوتا تھا۔

شیخ پیر میرٹھی کے انتقال پر محمد صادق نے یہ تاریخ کہی تھی[112]

گفت تاریخ وفاتش خرد دور اندیش
دِہ کہ از مردانِ وی بی سر و پا شد نغمہ

اگر نغمہ کے سر اور پاؤں یعنی "ن" اور "ہ" حذف کر دیے جائیں تو "غم" باقی رہ جاتا ہے اور حروفِ ابجد کے حساب سے اس کے عدد ۱۰۴۰ ہوتے ہیں اور یہی ان کا سالِ وفات ہے۔

راگ درپن میں سیف خان نے عہدِ شاہجہان کے جن ۳۲ موسیقاروں کا ذکر کیا ہے، ان میں صوفی بہاء الدین سرِ فہرست ہیں۔ آپ جھنجھانہ کے ایک قریبی گاؤں برناوہ کے رہنے والے تھے لیکن سیر و سیاحت کا شوق انہیں اوائل عمر میں ہی دکن لے گیا۔ وہاں آپ نے ۲۵ سال درویشوں کی خدمت میں گذارے اور ان کی صحبت میں رہتے ہوئے خود بھی درویش کامل بن گئے۔ آپ ہمیشہ سبز رنگ کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ سیف خان رقمطراز ہے کہ دکن میں رہتے ہوئے آپ نے سنگیت میں کمال حاصل کیا۔ شاہجہان کے دور میں اس فن میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ آپ ترانہ اور خیال بہت اچھا گاتے تھے اور رباب اور بین امرتی بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

---

[111] ایضاً۔

[112] ایضاً، ورق ۳۱۳ الف۔

آپ نے "خیال" نامی ایک ساز بھی ایجاد کیا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں آپ دکن سے واپس لوٹے اور بقیہ عمر اپنے آبائی وطن میں فقر و تجرد میں گذار دی۔ سیف خان کی روایت کے مطابق آپ نے ۱۰۰ سال کی عمر پائی[۱۱۳]

شیخ شیر محمد بھی اس دور میں ایک نامور موسیقار اور صاحب دل درویش ہوئے ہیں۔ ان کی تربیت صوفی بہاء الدین اور شیخ نصیر الدین نے کی تھی۔ شیخ نصیر الدین کی دعا سے انھوں نے نغمہ و سرود میں خوب ترقی کی اور سلطان حسین شرقی کی طرز کو مقبول بنانے میں پوری تندہی سے مصروف رہے۔ سیف خان نے انھیں دیکھا تھا اور اس کے خیال میں وہ "خیال" خوب جانتے تھے اور اس طرز کے گانے میں دردمند تھے۔ اسی وجہ سے وہ درویشوں کی مجلس میں بڑے مقبول تھے۔ وہ خیال کے علاوہ ترانہ اور تلہ بھی گا لیتے تھے۔ ع

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

انھوں نے بڑھاپے میں مرض استسقا میں وفات پائی اور اس وقت ان کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی[۱۱۴]۔ عنایت خان راسخ شیخ شیر محمد کو اکبر آباد کے رہنے والے بتاتا ہے اور اس کے خیال میں وہ قوالی کے بڑے ماہر تھے اور گاہ گاہے شاہجہان کے حضور میں اس فن کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے[۱۱۵]۔

---

[۱۱۳] سیف خان، راگ درپن، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، نمبر ۱۲۱ علوم فارسیہ، ورق ۲۲ ب، سنہ تصنیف

[۱۱۴] ایضاً، ورق ۴۳ الف، ۴۳ ب - ۴۴ الف

[۱۱۵] عنایت خان راسخ، رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۱ء، ص ۲۰۔

میاں ڈالو ڈاڈھی[116] شیخ شیر محمد کے ہم قوم اور اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے وہ درویشانہ وضع رکھتے تھے اس لئے اہل دولت سے ملنا جلنا انہیں ناپسند تھا۔ سیف خان نے ان کا راگ سن کر یہ کہا تھا۔

در دہرپد خواندن ہمچو اُو دیگری شنیدہ نشد[117] — ان جیسا دہرپد اور کوئی گویا نہیں گا سکتا۔

سیف خان جیسے فنکار کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ :۔

دی سبکو ہمچو می نواخت کہ مثل او دیگری نشدہ و در ہیچ عصری نشنیدہ[118] — وہ گھڑا بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور کسی دور میں بھی ان جیسا فنکار سننے میں نہیں آیا۔

میاں ڈالو نے اکبر آباد میں ذات الجنب کے مرض سے وفات پائی۔ ان کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔

شیخ شیر محمد کا بھائی بوجا بھی اچھا گویا تھا وہ بعارضہ بھگندر اکبر آباد میں فوت ہوا۔ وفات کے وقت اس کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی[119] شیخ شیر محمد کا پوتا معین الدین بھی اپنے آبائی فن میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ شاہنواز خان کا بیان ہے کہ وہ خیال بہت ہی اچھا گاتا تھا۔[120] عنایت خان راسخ نے اُسے — رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان — کی تدوین کے وقت احمد شاہ کے پانچویں سال جلوس میں دیکھا تھا، اس وقت وہ کافی عمر ہو چکا تھا۔

---

[116] ابوالفضل لکھتا ہے کہ ڈاڈھی پنجابی گویوں کو کہتے ہیں اور وہ ڈہڈہ اور کنگرہ بجا کر گاتے ہیں :۔ آئین اکبری، جلد ۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۷ء، ص ۱۴۲

[117] راگ درپن، ورق ۴۴ ب

[118] ایضاً

[119] ایضاً، ورق ۴۷ الف

[120] مراٗت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۷ الف

اس کا یہ کہنا ہے کہ اپنے زمانے میں وہ قوالی اور ترانہ گانے اپنی مثال آپ تھا۔[۱۲۱]

میاں ڈالو ڈاڈھی کا شاگردِ رشید شیخ کمال بھی بڑا اچھا گوّیا تھا۔ سیف خان کے ساتھ اس کی اکثر صحبت رہتی تھی۔ ۱۰۷۶ھ میں راگ درپن کی تصنیف کے وقت شیخ کمال بقیدِ حیات تھا لیکن نغمہ و سرود سے کنارہ کش ہو کر فوج میں بھرتی ہو چکا تھا۔[۱۲۲]

کبیر قوال شیخ بشیر محمد کا شاگرد تھا اور قوالی کے فن میں اپنے اُستاد سے بھی گوئے سبقت لے گیا تھا۔ اس نے قوالی کی ایک نئی طرز وضع کی تھی۔ شاہی دربار میں بھی اُسے بڑی عزت کا مقام حاصل تھا۔[۱۲۳] راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ زندہ تھا اور سیف خان کو اکثر راگ اور قوالی سے محظوظ کرتا رہتا تھا۔[۱۲۴]

بانیانی نائی بڑی اچھی طبیعت کا مالک تھا اور اس نے ہندوستانی اور ایرانی نغموں کو ملا کر ایک نئی طرز نکالی تھی۔ ماہرین فن کا یہ کہنا ہے کہ بانیانی نائی کے راگ میں بڑی تاثیر تھی۔ ایک موقع پر اس نے شاہجہان کی مدح میں قصیدہ پڑھا جس کے صلہ میں اُسے اپنے وزن کے برابر پانچ ہزار روپے ملے۔[۱۲۵] سیف خان نے روڑا قوال کے فن کی بھی تعریف کی ہے

---

[۱۲۱] رسالہ ذکرِ مغنیانِ ہندوستان، ص ۳۶

[۱۲۲] راگ درپن، ورق ۴۵ ب

[۱۲۳] رسالہ ذکرِ مغنیانِ ہندوستان، ص ۳۶،

[۱۲۴] راگ درپن، ورق ۴۷ الف

[۱۲۵] برہان الدین، شاہجہان نامہ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری آذر کلکشن نمبر ۷۶۲، ورق ۱۰۶۳ ب۔

وہ بھی شاہجہان کے حضور میں قوالی پیش کیا کرتا تھا[۱۲۶]۔ شاہجہان کے عہد میں شیخ شیر محمد، کبیر، روڑا اور میر صالح بڑے اونچے پایہ کے قوال تھے اور اس فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت درویشوں کی خانقاہوں میں ہی گذرتا تھا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ انہیں کے دم قدم سے کئی خانقاہوں کی رونق قائم تھی۔ پیشہ ور گویوں میں سے جہانگیر کا درباری طبنورہ نواز شوقی ہنوز زندہ تھا۔ وہ ہندی اور ایرانی راگ سے کماحقہٗ واقف تھا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں اور سیف خان نے راگ درپن میں اس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے[۱۲۷]۔

جگن ناتھ کلاونت شاہجہان کا درباری گویا تھا اور دھرپد گانے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ تان سین کے بعد اس جیسا گویا سرزمینِ ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ جب تان سین نے جگن ناتھ کو گاتے ہوئے دیکھا تو بیساختہ کہا کہ اس کے بعد وہ اس فن پر کام کرے گا[۱۲۸]۔ قزوینی ساتویں سالِ جلوس کے واقعات کے ضمن میں اس کے متعلق لکھتا ہے:-

جگنات کلاونت کہ بخطاب مہاکب رائے	جگن ناتھ کلاونت، جو مہاکب رائے کے
ناموراست ودر ساختن تصنیف ہندی	لقب سے مشہور ہے، بلندپایہ اور معنی خیز

---

[۱۲۶] راگ درپن، ورق ۴۷ الف

[۱۲۷] ا- تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۱۸۶۔
اا- راگ درپن، ورق ۴۹ ب

[۱۲۸] ایضاً، ورق ۴۵ الف۔

ہندو موسیقی دان کی بھی ویسی ہی عزت افزائی کی ہمارے خیال میں جہاں تک علم و فن کا تعلق ہے ہندو اور مسلمان دونوں اس کی نظر میں مساوی تھے۔

مسلمان موسیقاروں میں دربار شاہجہان میں لعل خان کلاونت کا بڑا اونچا مرتبہ تھا لعل خان ابھی نو عمر ہی تھا جب وہ تان سین کی خدمت میں اکتساب فیض کی غرض سے حاضر ہوا۔ تان سین نے کمال توجہ سے اس کی تربیت شروع کی۔ ابھی یہ نو آموز ہی تھا کہ تان سین کو پیغام اجل آ پہنچا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کے فرزند بلاس خان نے اُسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ جب وہ اس فن میں خوب طاق ہو گیا تو بلاس خان نے اپنی بیٹی اس کے حبالۂ نکاح میں دے دی۔ سیف خان نے اُسے اپنے وقت کا سب سے بڑا دھرپد راگی لکھا ہے[130] عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ سے بھی سیف خان کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے[131]

شاہجہان کے دربار میں اس کا بڑا عالی رتبہ تھا اور وہ تان سین کی جگہ پر کھڑا ہو کر اپنا راگ پیش کیا کرتا تھا۔ شاہجہان کو چونکہ دھرپد راگ بے حد مرغوب تھا اس لئے وہ لعل خان کی بڑی قدر کیا کرتا تھا اور ہر جشن کے موقع پہ اُسے انعام و اکرام سے لاد دیا کرتا تھا۔ عبدالحمید لاہوری کی روایت کے مطابق ایک بار بادشاہ نے اس کا راگ سُن کر اُسے گن سمندر کا خطاب اور ایک ہاتھی بطور انعام دیا تھا[132]

---

[130] راگ درپن ، ورق ۴۲ ب

[131] بادشاہنامہ، جلد ۲، ص ۵ — "در عہد سعادت مہد سرآمد نغمہ سرایان ہندوستانی زبان است و در خواندن دھرپدہای او بروش او عدیل ندارد"

[132] ایضاً ، ص ۳۱۱

لعل خان نے ۱۰۶۲ھ میں بعارضہ فالج انتقال کیا۔ بقول سیف خان وفات کے وقت اس کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی۔

لعل خان کے بیٹے خوشحال خان اور بسرام خان بھی شاہی دربار میں ملازم تھے۔ ان میں سے اول الذکر کا راگ شاہجہان کو بہت پسند تھا۔ لعل خان کے مرنے کے بعد اس کا منصب خوشحال خان کو ملا اور اسے بھی تان سین کے مقام پر کھڑے ہو کر گانا پیش کرنے کا شرف حاصل تھا۔[۱۳۳]

عنایت خان راسخ اور شاہنواز خان نے خوشحال خان کے متعلق ایک بڑا ہی دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرشد قلی خان دربار سے رخصت چاہتے تھے لیکن شاہجہان کسی طرح بھی اسے رخصت دینے پر آمادہ نہ تھا۔ مرشد قلی خان نے امیر الامراء کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی خاص موقع پر اس کی درخواست شاہجہان کے حضور میں پیش کر دے گا۔ کئی روز تک یہ دونوں بادشاہ کا موڈ دیکھتے رہے لیکن شاہجہان کا موڈ ہی درست ہونے میں نہ آتا تھا۔ بالآخر ان دونوں نے خوشحال خان کو ایک بڑی رقم کا لالچ دے کر بادشاہ کے حضور میں ایک سحر آفریں راگ پیش کرنے پر آمادہ کر لیا۔ خوشحال خان نے تان سین کے مقام پر کھڑے ہو کر راگ چھیڑا اور جب شاہجہان راگ سننے میں ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا، امیر الامراء نے مرشد قلی خان کی عرضی بادشاہ کے حضور میں پیش کر کے اس پر بادشاہ کے دستخط کروا لئے۔ جب بادشاہ

---

[۱۳۳] عنایت خان راسخ۔ رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۱ء۔ ص ۴۵

ہوش میں آیا اور اُسے حقیقتِ حال معلوم ہوئی تو اس نے خوشحال خان کو تان سین کے مقام پہ کھڑا ہونے سے منع کر دیا۔[۱۳۴ الف]

جگن ناتھ، لعل خان، خوشحال خان اور بسرام خان کا ذکر کرتے ہوئے عہدِ شاہجہان کے مؤرخوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ گویّے تان سین کے بالواسطہ یا بلاواسطہ شاگرد تھے اور تان سین کی طرز میں خوب گاتے تھے۔ محمد امین قزوینی اور عبدالحمید لاہوری، دونوں عہد شاہجہان کے نامور مؤرخ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شاہجہان کے عہد میں تان سین کی طرز خواص و عوام میں بہت مقبول تھی۔ قزوینی کے الفاظ ہیں۔

بالفعل طرزِ تان سین درمیان مردم متداول است چون مدتہا در خدمتِ حضرت عرش آشیانی بودہ طرز و روش و تصانیف او شیوع تمام یافتہ و اکثر کلاونتان این عصر دھرپت ہائی او را می خوانند و بروش تصنیف می سازند۔[۱۳۵]

ان دنوں تان سین کی طرز عوام میں کافی مقبول ہے۔ وہ چونکہ مدّت دراز تک اکبر کی خدمت میں رہا تھا اس لیے اس کی طرز، روش اور تصانیف نے خوب رواج پایا۔ اس زمانے کے اکثر کلاونت اس کے مرتب کردہ دھرپد گاتے ہیں یا پھر اس کی لے میں خود مرتب کرتے ہیں۔

گُن خان کلاونت بھی شاہجہان کا درباری گویّا تھا اور بقول سیف خان وہ علم راگ میں اُستاد تھا۔ شہزادہ شجاع کو اس کا راگ بے حد مرغوب تھا،

[۱۳۴ الف] ایضاً، ص ۴۶، ۴۵، ۱۱ - مرآت آفتاب نما، ورق ۲۹۵ ب

[۱۳۵] بادشاہنامہ، ورق ۳۳۰ ب، ۳۳۱ الف

اس لیے اس نے اسے شاہجہان سے مانگ لیا تھا۔ گن خان کی بقیہ عمر بنگال میں شہزادہ کی خدمت میں گزری اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔[۱۳۶] شہزادہ شجاع کا ایک اور مصاحب مصری خان، جو پنجاب کا رہنے والا اور بلاس خان کا شاگرد تھا، اپنے وقت کا بہترین گویا تھا۔ سنہ ۱۰۷۶ھ میں راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ہنوز زندہ تھا اور اس کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی۔[۱۳۷]

ہندو گویوں میں سے اکبر کا ایک ہم عصر گویا جمہ سین شاہجہان کے عہد میں تقریباً اسی سال کی عمر میں فوت ہوا تھا۔ سیف خان نے اس کا شمار کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے۔ اس کا بیٹا اُبل سین عہدِ شاہجہان کے گنے چنے موسیقاروں میں شمار ہوتا ہے۔ بقول سیف خان چالیس برس کی عمر میں اس کے تمام دانت نکل گئے تھے اور چند سال بعد عقل بھی جاتی رہی تھی۔ شاہجہان کے عہدِ حکومت میں ہی پچاس سال کی عمر میں وہ رام جی کو پیارا ہوا۔[۱۳۸]

ایشوری پرشاد کی روایت کے مطابق جنار دھن بیکانیری بھی بڑا اچھا گویا تھا اور وہ گاہ گاہے شاہجہان کے حضور میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔[۱۳۹]

---

[۱۳۶] راگ درپن، ورق ۴۶ ب

[۱۳۷] ایضاً، ورق ۴۵ الف

[۱۳۸] ایضاً، ورق ۴۸ الف [۱۳۹] اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۷۶۶ ۔

تلسی رام اور دہرم داس نام کے دو گویے، جن کا شمار سیف خان نے کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے، شاہجہان کے دربار میں ملازم تھے۔ یہ دونوں دین و دھرم سے بیگانہ یا بالفاظ دگر "زندگی برائے فن" کے قائل تھے۔ اول الذکر نے شاہجہان کے عہد میں ہی انتقال کیا لیکن مؤخرالذکر راگ درپن کی تالیف کے وقت زندہ تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ اب وہ ضعیف ہو چکا ہے اور اس کی آواز بھی خراب ہو گئی ہے۔[۱۴۰]

ان ہندو گویوں میں راقم الحروف کا ہم وطن کب جوت بھلوری بھی بڑا نامور فن کار تھا۔ سیف خان نے بھی اس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے اسّی اور نوّے برس کے درمیان عمر پائی اور اپنے وطن مالوف میں ہی فوت ہوا۔[۱۴۱] شاہجہان کے عہد میں سندر گھن نامی ایک موسیقار کی بڑی شہرت تھی۔ شاہجہان نے اُسے اپنے درباری گویوں میں شامل کر لیا تھا۔ تلسی رام اور دہرم داس کی طرح وہ بھی مذہب سے بیگانہ تھا۔[۱۴۲]

سور داس پکھاوجی بھی اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ اس نے اکبر کا عہد دیکھا ہوا تھا اور وہ تان سین کے ساتھیوں

---

[۱۴۰] راگ درپن، ورق ۴۷ الف، ۴۷ ب۔ [۱۴۱] ایضاً، ورق ۴۷ ب

[۱۴۲] ایضاً، ورق ۴۸ ب مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سندر گھن اس کا لقب تھا، کیونکہ گھن ایک ساز کا نام ہے وہ گھن بجانے میں ماہر تھا اس لئے اس نے سندر گھن کا لقب پایا۔ اس کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا۔ سیف خان نے بھی اس کا ذکر اسی لقب کے تحت کیا ہے۔

ہیں سے تھا۔ جب تان سین گاتا تو یہ اس کے ساتھ پکھاوج بجایا کرتا تھا۔ آخر عمر میں وہ گانے بجانے سے معذور ہو گیا تھا۔ سیف خان نے اُسے دیکھا ہوا تھا اور بقول اُس کے اُس نے سو سال کے قریب عمر پائی۔[۱۴۳]

کرپائی نامی ایک درباری گویا بھی اسی۔ از دین بیگانہ۔ گروہ سے تعلق رکھتا تھا، اور بقول سیف خان وہ بادشاہ کا منظورِ نظر تھا۔ شاہجہان نے اس سے مردنگ سن کر اُسے مردنگ رائے کے خطاب سے نوازا تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ مردنگ بجانے میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔[۱۴۴]

تارا چند کلاونت شوقی طنبورہ نواز کا شاگرد تھا لیکن اس نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ اس لئے وہ زیادہ نام نہیں پا سکا۔ سیف خان نے اس کا ذکر عہدِ شاہجہان کے گنے چنے فنکاروں میں کیا ہے۔[۱۴۵] ہندو گویوں میں سے سالم چند ڈاگر بھی اچھا گویا تھا اس کا شمار بھی شاہجہان کے درباری گویوں میں ہوتا ہے۔[۱۴۶]

رس بین کا شمار بھی شاہجہان کے منظورِ نظر گویوں میں ہوتا ہے۔ اس کا باپ بھی بڑا اچھا گویا تھا اور وہ جہانگیر کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ رس بین راقم السطور کو اس کا لقب معلوم ہوتا ہے، سیف خان نے اس کا نام نہیں لکھا حالانکہ وہ گاہ گاہے رس بین سے راگ سنتا رہتا تھا۔[۱۴۷]

---

[۱۴۳] ایضاً، ورق ۴۹ ب

[۱۴۴] ایضاً۔ ورق ۴۹ الف

[۱۴۵] ایضاً، ورق ۴۹ ب

[۱۴۶] ایضاً، ورق ۴۶ ب

[۱۴۷] ایضاً، ورق ۴۸ ب

مسلمان گویّوں میں بابنہ بد بڑا اچھا فن کار تھا اور رباب بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ نوجوانی کے عالم میں اُسے شراب کی لت پڑ گئی اس لیے جلد ہی مر گیا۔ اس کا ایک ہندو شاگرد سُکھ سین کلاونت بھی رباب بجانے میں ماہر تھا۔ سیف خان نے اس کا ذکر عہدِ شاہجہان کے ممتاز فن کاروں میں کیا ہے۔[۱۴۸]

الیشوری پرشاد کی روایت کے مطابق شاہجہان کا درباری مؤرخ محمد صالح کنبوہ اور اس کا بھائی ہندی راگ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔[۱۴۹] مسلمان فن کاروں میں نیروز ڈاڈھی پکھاوج بجانے میں، الہداد ڈاڈھی ساکن اُڑمُڑ ٹانڈہ سارنگی بجانے میں، ابو الوفا طنبورہ بجانے میں، طاہر ڈاڈھی دُف بجانے میں اور صالح رباب بجانے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔[۱۵۰] ان میں سے مؤخر الذکر سیف خان کی سرکار میں ملازم تھا۔ عہدِ شاہجہان میں محمد نامی ایک فنکار بین بجانے میں ملک کے طول و عرض میں مشہور تھا۔ بادشاہ نے ازرہِ قدر دانی اُسے —— رس بین —— کا خطاب دیا تھا۔[۱۵۱]

غلام محی الدین نامی ایک موسیقار فوج میں ملازم تھا۔ آخر عمر میں اس نے فوج کی ملازمت ترک کر کے درویشی اختیار کر لی تھی۔ سیف خان نے اس کے مُرتب کردہ راگوں کی بڑی تعریف کی ہے۔

---

[۱۴۸] ایضاً

[۱۴۹] اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا۔ مطبوعہ الہ آباد سنہ ۱۹۳۰ء، ص ۷۶۶

[۱۵۰] راگ درپن، ورق ۴۹ الف، ۴۹ب

[۱۵۱] ایضاً۔ ورق ۴۹ الف۔

راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ابھی بقیدِ حیات تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ وہ لوگوں کی پرواہ نہیں کرتا اس لئے لوگ بھی اس سے چنداں متعارف نہیں ہیں۔[152]

شیخ سعد اللہ لاہوری بھی کسی زمانے میں بڑا اچھا گویا سمجھا جاتا تھا لیکن کثرتِ افیون خوری سے اس کا گلا خراب ہو گیا تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت اس کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی اس لئے بوجہ کبر سنی اس کے ذہن میں فتور پیدا ہو گیا تھا۔[153] شیخ موصوف کی طرح محمد باقی مغل بھی کسی زمانے میں اچھے گویوں میں شمار ہوتا تھا لیکن شیخ کی طرح افیون کھانے سے اس کی آواز بھی خراب ہو گئی تھی۔ جب سیف خان راگ درپن لکھنے بیٹھا تو اس وقت اس کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔[154]

مسلمان گویوں میں بازبد خان لوجہاروی بڑا اچھا فنکار تھا۔ سیف خان نے اس کا ذکر کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے۔ اس نے زیادہ عمر نہیں پائی تاہم اس کا نام خدمتِ فن کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔[155] ڈولی ڈادھی بھی اپنے دور میں بڑا اچھا موسیقار مانا جاتا تھا۔ بقول سیف خان اس نے اسی سال سے زیادہ عمر پائی اور آگرہ میں فوت ہوا۔[156]

شاہجہان کے درباری گویوں میں رنگ خان کلاونت کا بڑا اونچا

---

[152] ایضاً۔ [153] ایضاً۔ ورق ۴۶ ب

[154] ایضاً۔ ورق ۴۶ ب، ۴۷ الف [155] ایضاً۔ ورق ۴۰ الف

[156] ایضاً۔ ورق ۴۶ ب

رتبہ تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ وہ اسم بامسمّٰی اور اپنے فن میں اُستاد تھا اور اس نے اکبر کا عہد دیکھا ہوا تھا۔ وہ شاہجہان کا منظورِ نظر تھا اس لئے شاہی تقریبات کے موقع پہ بادشاہ اُسے انعام واکرام سے نوازتا رہتا تھا۔ اورنگ زیب کی شادی کی تقریب پہ اور ۱۰۴۵ھ میں نوروز کے موقع پہ اس کا نام انعام یافتگان کی فہرست میں موجود ہے۔[۱۵۷] سیف خان لکھتا ہے کہ دربار شاہی کے باہر اس کا زیادہ تر وقت اللہ والوں کے ساتھ گزرا کرتا تھا۔ اس نے اسّی اور نوّے برس کے درمیان عمر پائی۔[۱۵۸]

بلاس خان کے شاگردوں میں لجنت خان گجراتی نے بڑا نام پایا تھا۔ سیف خان نے اس کا ذکر کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے۔ سیف خان لکھتا ہے کہ لوگ اس کے راگ کی بہت تعریف کرتے ہیں لیکن مجھے اس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ میں نے اس کے ایک شاگرد بسنتھی کلاونت کو سنا ہے، وہ خوب گاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ لجنت خان کتنا اچھا گویا ہوگا۔[۱۵۹]

مسلمان گویّوں میں نایک بھنّو کا پوتا نایک افضل بھی بڑا اچھا گویا تسلیم کیا جاتا تھا۔ شاہجہان نے اس کے کمالِ فن کا اعتراف کرتے

---

[۱۵۷] : محمد صالح کنبوہ، شاہجہان نامہ، جلد دوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۳، ۱۸۹، ۲۱۸

۱ : عبدالحمید لاہوری، بادشاہنامہ، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء، ص ۱۴۲

[۱۵۸] راگ درپن، ورق ۴۶ الف

[۱۵۹] ایضاً، ورق ۴۵ ب۔

اُسے گُن سین کا خطاب دیا تھا۔ نائب افضل کا انتقال کشمیر کے سفر کے دوران ہوا اور وفات کے وقت اس کی عمر پچاس سال سے متجاوز تھی[۱۶۰]۔ سیف خان نے راگ درپن میں حسین خان لوہار کا ذکر بھی عہدِ شاہجہان کے ممتاز گویّوں میں کیا ہے۔ اس کی عمر بھی کوئی زیادہ نہیں ہوئی[۱۶۱]۔

عہدِ شاہجہان میں سبحان خان کا شمار بڑے نامی گرامی گویّوں میں ہوتا تھا۔ ان کی طبیعت درویشی کی طرف مائل تھی۔ اس لئے ان کا زیادہ وقت درویشوں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ آخر عمر میں تو اُنھوں نے دنیا سے بالکل ہی منہ موڑ لیا تھا۔ عنایت خان راسخ اور شاہنواز خان کی روایات کے مطابق وہ آخر عمر میں مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہاں روضۂ رسولؐ پر نعتیں پڑھا کرتے تھے[۱۶۲]۔ ان کا فرزند سیّد خان بھی بڑا اچھا گویّا تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ کافی ضعیف العمر ہو چکا تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ وہ امیر خسروؒ کے علم کا ماہر تھا۔ راگ خوب گاتا تھا تاہم دُھرپد بھی بُرا نہیں گاتا[۱۶۳]۔

سید طیب بڈھ بھی عہدِ شاہجہان کے نامی گرامی گویّوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ آگرہ کا رہنے والا تھا اور "بات" خوب گاتا تھا۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی[۱۶۴]۔ میر عماد سادات ہرات سے تعلق رہتا تھا۔ اس کا شمار بھی شاہجہان کے عہد کے مشاہیر گویوں میں ہوتا ہے۔ راگ درپن کی تصنیف

---

[۱۶۰] ایضاً   [۱۶۱] ایضاً۔

[۱۶۲] ا۔ رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، ص ۴۷   اا۔ مرأت آفتاب نما، ورق ۲۹۶ ب

[۱۶۳] راگ درپن، ورق ۴۸ الف   [۱۶۴] ایضاً۔

کے وقت میر عماد حیات تھا۔ سیف خان نے اس کے راگ کی بڑی تعریف کی ہے۔[۱۶۵] اسی طرح رحیم داد ڈاڈھی کا شمار بھی اس وقت کے اچھے گویوں میں ہوتا تھا۔ سیف خان نے اس کے استادِ کامل ہونے کا اعتراف کیا ہے۔[۱۶۶] ان گویوں کے علاوہ بیانہ کے ایک سور نالواز کی بھی سیف خان نے بڑی تعریف کی ہے۔ سیف خان راگ درپن کی تصنیف کے وقت اس کا نام بھول چکا تھا، اس لئے اس نے اس کا ذکر "یک سور نالواز از بیانہ" کے عنوان کے تحت کیا ہے۔ اسی طرح ایک اور سور نالواز جو داراشکوہ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اپنے فن کا اُستاد مانا جاتا تھا، سیف خان کے ذہن سے اس کا نام بھی محو ہو چکا تھا۔[۱۶۷]

شاہجہان کا عہدِ حکومت ہر لحاظ سے مغلوں کا عہدِ زریں کہلانے کا مستحق ہے۔ فنِ تعمیر، موسیقی، مصوری، خطاطی اور دوسرے علوم و فنون کو اس عہد میں نمایاں ترقی ہوئی۔ بعض اہلِ معرفت ان سب فنون کو ایک ہی چیز تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں "فنِ تعمیر کا حسن وہی حسن ہے جو شاعری، موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی میں نظر آتا ہے"[۱۶۸] جس طرح اقبال کو ہر چیز میں جلوۂ عشق نظر آتا ہے اور وہ بدر و حنین اور معرکۂ کربلا کو بھی عشق ہی کا نام دیتے ہیں اُسی طرح ہمارے فنافی الفن قسم کے فنکاروں کو شاہجہان کے ہر رگ و ریشے اور اس کے ہر قول و فعل سے نغمہ ہی سنائی دیتا ہے۔ ان کے نزدیک جامع مسجد دہلی، لال قلعہ اور تاج محل کی تعمیر کے

---

[۱۶۵] ایضاً۔ [۱۶۶] ایضاً، ورق ۴۷ ب [۱۶۷] ایضاً، ورق ۴۹ ب

[۱۶۸] پروفیسر محمد مجیب، مضمون "قطب صاحب کی عمارتیں"، مشمولہ "نذرِ عرشی" مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۵

پیچھے بھی شاہجہان کا ذوقِ موسیقی ہی کارگر نظر آتا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب تاج محل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

> تاج محل میں معمار کا تصور ان بلندیوں تک پہنچ گیا ہے جہاں عمارت، شعر اور نغمہ مل کر وجد کی کیفیت بن جاتے ہیں۔[۱۶۹]

ہمارے خیال میں یہ فنِ موسیقی کی CLIMAX (انتہا) ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی مملکت سے غیر اسلامی آثار مٹانے پہ کمر باندھی۔ اسی پروگرام کے تحت اس نے اپنے گیارہویں سال جلوس میں تمام موسیقاروں اور سازندوں کو اپنے دربار سے نکال دیا۔ ایک دن یہ اہلِ فن ایک جھوٹ موٹ کا جنازہ لے کر شاہی محل کے قریب سے آہ و بکا کرتے ہوئے گزرے تو اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے ایک مصاحب سے دریافت کیا کہ یہ کس کا جنازہ ہے ؛ اس نے دست بستہ عرض کیا کہ موسیقی کا، اس جواب پہ اورنگ زیبؒ ہنس دیا اور اس نے موسیقاروں کو کہلا بھیجا کہ مردود مُردہ کو خوب گہرا کر کے دفن کرنا کہ کہیں پھر باہر نہ نکل آئے۔

* * *

---

[۱۶۹] پروفیسر محمد مجیب، مضمون "فنِ تعمیر" مشمولہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۶۳ء، ص ۳۴

مسلمانوں کی جغرافیائی خدمات

امومی حکومت کے خاتمہ تک مسلمانوں کی فتوحات مکمل ہو چکی تھیں اور عہد عباسی کے آغاز کے ساتھ ہی ان کی توجہ علم و ادب، سیر و سیاحت اور تجارت کی طرف مبذول ہوئی۔ مسلمانوں میں اپنی عظیم مملکت کو جاننے کا شوق پیدا ہوا تو انھوں نے جغرافیہ پر خاص توجہ دی۔ علاوہ ازیں بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات کے پیش نظر بھی انہیں ملک کے مختلف صوبوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے ہزار ہا ہزار اشخاص عازمِ حجاز ہونے لگے، تو ان کی رہنمائی کے لئے بھی جغرافیہ دانوں نے قلم اُٹھائے۔ اس طرح نویں صدی عیسوی کے اختتام سے قبل مسلمانوں میں کئی نامور جغرافیہ دان پیدا ہوئے جو دیکھتے ہی دیکھتے افقِ اسلام پر مہر و مہ بن کر چمکے۔

تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مامون الرشید نے اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے مشہور یونانی فاضل بطلیموس کی شہرۂ آفاق تالیف المجسطی کا عربی میں ترجمہ کروایا۔ اس دور کے اکثر و بیشتر مسلمان جغرافیہ دانوں

نے اس کتاب کو اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیا اور پھر اپنے مشاہدات و تجربات سے اس کتاب میں اضافے کیے۔

عہد مامون میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی ایک مشہور ریاضی دان جغرافیہ دان ماہر نجوم اور مہندس ہو گزرا ہے۔ مامون نے اُسے اپنے قائم کردہ بیت الحکمت میں تحقیق و تجسس میں لگایا وہاں اس نے علم جغرافیہ پر "صورۃ الارض" نام کی ایک کتاب لکھی جس میں اس نے زمین کو کرہ (GLOBE) تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ سولہویں صدی تک یورپ کے فضلاء زمین کو چپٹی قرار دیتے تھے۔ اور اس "عقیدہ" کا منکر کلیسا کی نظر میں مباح الدم سمجھا جاتا تھا۔

مامون کے زمانے ہی میں شام کے صحرا میں جغرافیہ دانوں نے تجربات شروع کیے اور زمین کی پیمائش کے جغرافیائی درجات متعین کیے۔

مسلمانوں نے موسموں کے اعتبار سے کرۂ ارض کو سات طبقات میں تقسیم کیا اور الفرغانی (م ۸۶۰ء) البتانی (م ۹۰۰ء) ابن یونس (م ۱۰۰۹ء) اور البیرونی (م ۱۰۴۸ء) نے مقامات کے ساتھ طول بلد اور عرض بلد لکھنے کے طریق کو رواج دیا۔

ابن خرداذبہ کو بجا طور پر "بابائے جغرافیہ" کہا جا سکتا ہے۔ وہ پہلا مسلمان جغرافیہ دان تھا جس نے جغرافیہ نویسی کے لیے عربی زبان میں قواعد مرتب کیے۔ اس کی بلند پایہ تالیف "کتاب المسالک" بعد میں آنے والے جغرافیہ دانوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی رہی۔ اس کتاب میں اس نے مختلف ممالک کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں کے درمیانی فاصلے بھی دیئے ہیں۔

احمد بن ابی یعقوب واضح الکاتب الیعقوبی (م ۸۹۰ء) نے بھی نویں صدی

میں دنیائے اسلام کی جی بھر کر سیاحت کی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے سرحدات کی طرف جانے والی شاہراہوں سے بھی کماحقہٗ واقفیت پیدا کر لی تھی۔ اس کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مملکت اسلام کی سرحدات پر دشمنان اسلام کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس مقصد کے تحت اس نے سرحدی علاقوں کی سیاحت پر زیادہ توجہ دی اور اپنا حاصل مطالعہ ایک کتاب کی صورت میں پیش کیا۔ یعقوبی نے افریقہ کے متعلق "افریقیہ" نام کی ایک الگ کتاب لکھی ہے۔

قدامہ بن جعفر الکاتب دسویں صدی عیسوی میں ایک نامور کاتب ہو گذرا ہے۔ اس نے اپنی تصنیف "کتاب الخراج وصنعت الکاتب" کے گیارہویں باب میں عہد عباسی کی ڈاک چوکیوں اور شاہراہوں کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں کو بازنطینی حکومت سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا اور اس خطرہ کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنی سرحدات سے چوکس رہنے اور سرحدی علاقوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی ضرورت رہتی تھی۔ قدامہ نے اسی دفاعی نقطہ نظر سے یہ معلومات جمع کی تھیں۔

اسی دور میں ابن رستہ (م ۹۱۰ء) بھی ایک مشہور جغرافیہ دان ہو گزرا ہے جس نے قدامہ کی طرز پر "اعلاق النفیسہ" نام کی ایک معرکۃ آلاراء کتاب قلمبند کی ہے۔ اس کتاب میں شاہراہوں کے ذکر پر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے متعلق جغرافیائی معلومات کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد تمام عالم خصوصاً مملکت اسلام کے متعلق بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔

اسی عہد کے ایک نامور جغرافیہ دان ابن الفقیہہ الہمدانی نے اپنی جغرافیائی معلومات کو ۹۰۳؁ میں "کتاب البلدان" میں پیش کیا ہے۔ اس نے بھی

ابن رستہ کی طرح مکہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ کے متعلق اپنی معلومات کتاب کے آغاز میں تحریر کی ہیں اور اس کے بعد دوسرے شہروں اور صوبوں پر قلم اُٹھایا ہے سلیمان نامی تاجر اپنے دور کا ایک نامور ملّاح تھا اور اس نے تجارت کی غرض سے ہندوستان اور چین تک بحری سفر کیا تھا۔ سلیمان کا سفرنامہ تو اب ضائع ہو چکا ہے لیکن الہمذانی نے اس کے اقتباسات اپنی کتاب میں جا بجا دے کر اہل علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ جس طرح ہندوستان کے متعلق البیرونی نے تحقیق کی تھی اسی طرح جزیرہ نما عرب پر الہمذانی کی تحقیق آخری سند تسلیم کی جاتی ہے۔

۹۲۱ء میں عباسی خلیفہ المقتدر نے ابن فضلان کو سفیر بنا کر بلغاریہ بھیجا تو اس نے اپنے سفر کے حالات قلم بند کر لئے ابن فضلان کے سفرنامہ کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں۔

علم فقہ کی طرح جغرافیہ میں بھی مختلف مکاتب فکر پائے جاتے ہیں اور ان میں سے بلخی مکتب کا بانی ابو زید احمد ابن سہل بلخی (م ۹۳۴ء) تھا جس کی کتاب "صور الاقالیم" نے شہرت دوام پائی۔ بلخی نے آٹھ برس عراق میں الکندی کی خدمت میں رہ کر جغرافیہ پر عبور حاصل کیا اور اس کے بعد سیاحت کے لئے نکلا۔ بلخ واپس لوٹ کر اس نے اپنا حاصل مطالعہ مذکورہ بالا کتاب کی صورت میں پیش کیا۔ بلخی کے مقلدین میں الاصطخری، ابن حوقل اور المقدسی بڑے اونچے پایہ کے جغرافیہ دان ہو گزرے ہیں۔ یورپ کے مستشرقین کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کے بنائے ہوئے نقشے اس زمانے میں یورپ میں بنائے ہوئے نقشوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ بلخی مکتب کے جغرافیہ دانوں نے جغرافیائی نظریات کو قرآن و حدیث سے تطبیق دینے کی جو کوشش کی تھی علمائے اسلام

اس کے لئے ان کے ممنونِ احسان ہیں۔

ابواسحٰق الاصطخری، ایران کے قدیم پایہ تخت پرسی پولس کا رہنے والا تھا، جسے عرب الاصطخر اور ایرانی تخت جمشید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی مشہور عالم کتاب "المسالک والممالک" کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دنیائے اسلام کی سیر و سیاحت بھی خوب کی تھی اور اثنائے سفر سیاحوں اور ملاحوں سے ملنے کے مواقع بھی اسے ملتے رہے تھے۔ اُس نے اپنی تصنیف میں تمام اسلامی ممالک کے نقشے بنانے کے علاوہ مختلف شہروں کے درمیانی فاصلے بھی درج کئے ہیں۔ الاصطخری نے دسویں صدی عیسوی میں اپنے مشاہدہ کی بنا پر جو دنیا کا نقشہ تیار کیا تھا اس پر ہم حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ بھی حال ہی میں شہنشاہِ ایران کے حکم سے شائع ہوا ہے۔

ابوالقاسم محمد بن حوقل کا نام تو ہم میں سے اکثر نے سنا ہوگا وہ بغداد کا رہنے والا تھا اور بچپن ہی سے اُسے علمِ جغرافیہ سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ ابن خردازبہ، جیہانی اور قدامہ کی تصانیف اس کے مطالعہ میں رہنے لگیں۔ ۹۴۳ء سے ۹۶۸ء تک اس نے دنیائے اسلام کی سیاحت کی اور اثنائے سفر بھی مذکورہ بالا کتب کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ اس سیر و سیاحت کے دوران اس نے اپنی مشہور عالم تصنیف "صورۃ الارض" کے لئے مواد جمع کیا اور اس کتاب کی مقبولیت اور قدر و منزلت کا اسی بات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابن حوقل کے بعد آنے والے اکثر و بیشتر جغرافیہ دانوں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

ابوالحسن علی بن حسین المسعودی (م ۹۵۶ء) صاحبِ مروج الذہب ایک

نامور مؤرخ اور سیّاح ہو گذرا ہے۔ جس نے دسویں صدی میں تمام دنیائے اسلام کی سیر کر کے اہلِ علم سے "جہانگشت" کا خطاب پایا ہے۔ اپنے سفر کے دوران اُسے چین جانے کا بھی اتفاق ہوا اور افریقہ کے مشرقی ساحل کے متعلق تو اس کی فراہم کردہ معلومات علم کا ایک بیش بہا خزانہ سمجھی جاتی ہیں۔ اثنائے سفر اُسے تجربہ کار اور نڈر مسلمان ملّاحوں سے تبادلۂ خیال کرنے کا خوب موقع ملتا رہا اور مسعودی نے بحر ہند اور خلیج فارس کے متعلق ان کی معلومات کو عام جغرافیہ دانوں سے کہیں زیادہ پایا۔ مسعودی نے بھی قدامہ اور ابن رُستہ کی طرح عباسی مملکت کی شاہراہوں اور ڈاک چوکیوں کی تفصیل اپنی "تالیفات" میں دی ہے اور ان کے مفروضات کو بے نقاب بھی کیا ہے۔ مسعودی کی "تالیفات" میں مروج الذہب، اخبار الزمان اور عجائب الدنیا بڑے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔!

اسی سلسلے میں سامانیوں کے مایۂ ناز وزیر ابو عبداللہ محمد بن احمد الجیہانی کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ ہر چند اس کی تالیف "کتاب المسالک والممالک" اب ضائع ہو چکی ہے۔ تاہم اس کی اہمیت کا اندازہ مسعودی اور دوسرے جغرافیہ دانوں کے بیانات سے لگایا جا سکتا ہے۔ الجیہانی کا وقت چونکہ بخارا میں سامانیوں کے دربار میں گذرا تھا اس لئے وسط ایشیا کے متعلق اس کی معلومات عرب میں بسنے والے جغرافیہ دانوں کی نسبت زیادہ صحیح تھیں۔ علاوہ ازیں عہدۂ وزارت پر فائز رہ کر اس نے سرکاری ذرائع سے کافی معلومات حاصل کی ہوں گی جن کی فراہمی دوسروں کے لئے اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ یہ کتاب اگر کسی کتب خانہ سے دستیاب ہو جائے تو اہلِ علم اُسے حرزِ جان بنا کر رکھیں اور اس کے مطالعہ سے اپنی آنکھوں کو جلا بخشیں۔

۹۸۲ء میں حدود العالم نام کی ایک کتاب فارسی زبان میں جغرافیہ پہ لکھی گئی۔ اس کے مصنف کا نام تا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ فارسی زبان میں اس کتاب کی تالیف میں متعدد عربی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پروفیسر مینورسکی آنجہانی نے لندن سے شائع کی ہے۔ اس میں لاہور کے کے متعلق تحریر ہے کہ یہاں سیاہ مرچ خوب اُگتی ہے۔ میں نے اس بات کا فاضل مرتب سے ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ مصنف کے زمانے میں لاہور کی منڈی میں سیاہ مرچ بکثرت ہوتی ہو گی جس سے اس نے یہ اندازہ لگایا ہو گا کہ اس شہر میں سیاہ مرچ پیدا ہوتی ہے ویسے یہ بات بھی بعید از امکان نہیں کہ اس زمانے میں لاہور کی آب و ہوا گرم ہو اور یہاں سیاہ مرچ اُگتی ہو۔

ابو عبداللہ محمد بن احمد المقدسی (م ۱۰۰۰ء) جیسا کہ اس کی نسبت سے ظاہر ہے، بیت المقدس کا رہنے والا تھا راقم الحروف نے اسی[1] سال کے آغاز میں بیت المقدس کے مشہور تاریخی باغ گیتھسمینی کے دامن میں لبِ سڑک اس کے مزار کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو جلا بخشی ہے۔ اس نے جغرافیہ نویسی کے قواعد و ضوابط مرتب کئے اور کسی ملک پہ قلم اٹھاتے ہوئے وہاں کے باشندوں کے اخلاق و اطوار، قومی خصوصیت، پیداوار، مذہب و عقائد، اوزان اور لین دین کے طریقوں پہ بحث کا آغاز کیا یہ چیز عرب جغرافیہ دانوں کے ہاں بالکل نئی بات تھی۔ اسی بات سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ المقدسی کے نزدیک جغرافیہ دانی کا مفہوم کتنا وسیع تھا۔ اس کی تصنیف "احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم" آج بھی بڑے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

بزرگ بن شہریار (م ۱۰۰۹ء) اپنے دور کا نامور ملاح اور سیاح ہو گزرا ہے۔ اس کی کتاب "عجائب الہند" میں بحرِ ہند کے متعلق بہت سی دلچسپ

---

[1] یہ جنوری ۱۹۶۶ء کا ذکر ہے۔

معلومات پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جزائر مشرق الہند یا موجودہ انڈونیشیا کے متعلق بھی بہت سی دلچسپ حکایات اس کتاب میں مندرج ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اس طرح کی کتابوں کی مانگ بڑھ رہی تھی اور بزرگ نے اسی چیز کو دورانِ تالیف پیشِ نظر رکھا۔

ناصر خسرو علوی بھی پانچویں صدی ہجری میں ایک مشہور سیاح ہو گذرا ہے جس نے اپنے آبائی وطن قبادیان سے لے کر مصر تک سیاحت کی تھی۔ اس کا سفرنامہ سلیس فارسی نثر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ناصر خسرو اثنائے سفر ہر چیز کا بغور مطالعہ کر کے پھر اُسے اپنے سفرنامہ میں درج کرتا تھا۔ اس کا سفرنامہ اُس دور کی اسلامی دنیا کا ایک بہترین مرقع ہے۔

ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن المعروف بہ ابن یونس (م ۱۰۰۹ء) فاطمی خلیفہ العزیز کے عہد میں قاہرہ کی رصدگاہ کا انچارج تھا۔ اس نے پنڈولم کی حرکات سے وقت کو شمار کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ اور اپنے مشاہدہ سے انحراف شمس کو ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ پایا، جو موجودہ تحقیق کے عین مطابق ہے۔ ابن یونس نے کسی مقام کا طول بلد اور عرض بلد معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

شرف الدولہ بویہ کے عہد میں ابوسہل ویجان بن رستم الکوہی بڑا نامور جغرافیہ دان اور ماہر نجوم ہو گذرا ہے۔ ابوسہل بغداد کی رصدگاہ میں تجربات کیا کرتا تھا، اور وہیں اس نے اعتدالین ربیعی و خریفی تیار کیں۔ اندلس میں الزرقانی ایک شہرۂ آفاق ہیئت دان اور ماہر جغرافیہ ہو گذرا ہے۔ اس نے آلات ہیئت تیار کیے اور استقبال نقطۂ الاعتدالین کی صحیح مقدار بتائی اسی طرح ابوعبداللہ محمد البتانی نے "زیج البتانی" تیار کی اور یہ کتاب یورپ میں بے حد مقبول ہوئی اور وہاں جدید زمانے میں اس سے بہت مدد لی گئی البتانی

نے چاند اور دوسرے سیاروں کی گردش کا مطالعہ کیا اور زمین کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا کہ وہ ایک جزیرہ ہے جو چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (م ۱۰۴۸ء) سلطان محمود غزنوی کا درباری اور اپنے دور میں ریاضی، جغرافیہ، ہیئت اور سنسکرت کا زبردست عالم تھا۔ البیرونی نے یہ ثابت کیا ہے کہ کسی زمانے میں پنجاب اور سندھ کی جگہ سمندر ٹھاٹھیں مارا کرتا تھا بعد ازاں دریاؤں نے اس سمندر کو پہاڑوں سے مٹی لا کر پاٹ دیا اور کچھ جغرافیائی تبدیلیاں بھی اس طرح ہوئیں کہ سمندر پیچھے ہٹ گیا اور زمین اوپر اُبھر آئی۔ البیرونی نے آتش فشانی کی وجوہات مدّ و جزر کے اسباب، سورج اور چاند گرہن، زلزلے کے اسباب موسموں کی تبدیلی ہیروں کی پیدائش چشموں کے اجراء اور سطح زمین پر ہونے والی تبدیلیوں پر بہت کچھ لکھا ہے۔ البیرونی نے مساحت الارض کے قواعد مرتب کئے اور زمین کے محیط کو ۲۴۷۷۹ میل بتایا جو موجودہ پیمائش سے صرف ۲۰۰ میل کم ہے۔

ابن جبیر اندلسی (م ۱۲۱۷ء) ایک مشہور سیاح ہو گذرا ہے جس نے بحیرۂ روم اور فلسطین کی سیاحت کی اور نقشے تیار کئے۔ اس کی تصنیف "رحلۃ" آج بھی بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

یاقوت الحموی (م ۱۲۲۹ء) نے اپنی مشہور عالم تصنیف "معجم البلدان" میں دنیائے اسلام کے ہر چھوٹے بڑے قصبے اور شہروں کے نام، محل وقوع اور ان کی تاریخی اہمیت حروفِ تہجی کے لحاظ سے جمع کر دی ہے۔ اس کتاب سے ہمیں قرونِ وسطیٰ کے ان شہروں اور قصبوں کے محل وقوع بھی معلوم ہو جاتے ہیں جو منگولوں کے حملوں سے نیست و نابود ہو گئے۔ بعض لحاظ

سے اس کتاب کو انسائیکلوپیڈیا کہنا بے جا نہ ہوگا۔ یاقوت الحموی کے بعد القزوینی (م ۱۲۷۵ء) اور الدمشقی (م ۱۳۲۵ء) نے بھی اسی طرز پر کتابیں لکھیں لیکن ان کی شہرت معجم البلدان کے مقابلہ میں ماند پڑ گئی۔

ابن المجاور نے ۱۲۳۰ء میں "تاریخ المستنصر" کے نام سے جنوبی عرب کی تاریخ لکھی۔ اس کتاب میں جغرافیائی اور تمدنی معلومات بھی عام ملتی ہیں "تاریخ ثغر عدن" کے تحت ابن المجاور نے عدن میں بردہ فروشی کے متعلق جو شرمناک معلومات دی ہیں میرے خیال میں انہیں پڑھنے کے بعد ایک بار تو عربوں کے سر ندامت سے جھک جاتے ہوں گے۔

ابن فاطمہ (م ۱۲۵۰ء) بھی ایک نامور عرب سیاح ہو گذرا ہے جس نے افریقہ کی سیاحت کے بعد اپنا سفرنامہ مرتب کیا تھا۔ یہ سفرنامہ تو مدتیں ہوئی نابود ہو چکا ہے البتہ اس کے حوالے ابن فاطمہ کے بعد آنے والے جغرافیہ والوں نے اپنی کتابوں میں بڑی فراخدلی سے دیئے ہیں۔ ابن فاطمہ کے سفرنامہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ افریقہ کے متعلق مسلمانوں کی معلومات کافی تھیں اور وہ بحر اوقیانوس میں بھی سفر کے عادی تھے۔

بحیرۂ روم، خلیج فارس، بحیرۂ قلزم، بحیرۂ عرب اور بحر ہند تو مسلمانوں کی آماجگاہ تھے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ مسلمانوں کے خوف سے رومی مچھلی پکڑنے والی کشتیاں بھی بحر روم میں نہ ڈال سکتے تھے۔ سلیمان بن احمد مین کے شہر مہرہ کا رہنے والا اور مشہور ملاح ہو گذرا ہے۔ اس نے سولہویں صدی کے نصف اوّل میں سمندروں میں اپنے تجربات اور مشاہدات پر پانچ کتابیں لکھی تھیں۔

احمد بن ماجد بھی ایک مشہور ملاح ہو گذرا ہے جو مشرقی افریقہ کی بندرگاہ مالندی سے واسکوڈے گاما کو ۱۴۹۰ء میں کالی کٹ لایا تھا۔ پرتگیزوں کا بیان

کہ اس کے پاس ایک گائیڈ تھی جس میں اس نے خلیج فارس، بحیرۂ عرب، بحیرۂ قلزم اور بحر ہند کے متعلق معلومات جمع کر رکھی تھیں اور اس کی عمر کے پچاس برس سمندر ہی میں گزرے تھے۔ بقول بعض، قطب نما کی ایجاد کا سہرا بھی اسی احمد کے سر ہے۔

اکثر کتابوں میں سلیمان سیرافی نام کے ایک بحری کپتان کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جس نے چین تک سفر کیا تھا۔ عرب ملاّح عموماً چین سے ریشمی کپڑے انڈونیشیا اور ملایا سے گرم مصالحے اور قلعی، ہندوستان سے صندل، خوشبویات، عمارتی لکڑی اور ناریل عرب لیجاتے اور وہاں سے یہ مال اٹلی کی بندرگاہوں میں پہنچ جاتا اور پھر ہاتھوں ہاتھ یورپی تاجر اُسے دوسرے ممالک میں پہنچا دیتے۔

ابن بطوطہ (م ۱۳۷۷ء) مراکش کے مشہور شہر طنجہ کا رہنے والا اور بلاشبہ مسلمانوں میں سب سے بڑا سیاح ہو گزرا ہے اس نے مصر، شام، حجاز، عراق، ایران، ہندوستان، مالدیو، سیلون اور چین کے علاوہ وسط افریقہ تک سیاحت کی۔ سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں وہ کئی برس تک دہلی میں قاضی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ سلطان نے اسے سفیر بنا کر چین کے سفر پر روانہ کیا لیکن راستہ میں اس کا جہاز تباہ ہوا اور وہ بدقت تمام مالدیو اور سیلون ہوتا ہوا چین پہنچا۔ آخر عمر میں ابن بطوطہ اپنے وطن واپس ہوا اور وہاں اس نے "عجائب الاسفار" کے نام سے اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔ یہ کتاب اس دور کی اسلامی دنیا پر معلومات کی ایک کان ہے۔

علامہ ابن خلدون ہر چند کہ تاریخ اور عمرانیات کا ماہر تھا تاہم جغرافیہ پر بھی اس کی بڑی گہری نظر تھی۔ علامہ نے جو نقشہ تیار کیا تھا اسے پروفیسر روزن تھال نے مقدمہ ابن خلدون کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ ہی شائع

کر دیا ہے۔ نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ کو مرکزی مقام حاصل ہے، اور کرۂ ارض کو بحرِ محیط (ENCIRCLING OCEAN) نے گھیرا ہوا ہے۔ اس نقشہ میں سدِّ سکندری بھی واضح کی گئی ہے جو علامہ موصوف کے خیال میں کوریا کے قریب واقع ہے۔

خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ

خواجہ محمد ہاشم کشمی ولایتِ بدخشاں کے رہنے والے تھے لیکن آپ کا نصیبِ طالع آپ کو ہندوستان لے آیا۔ ان دنوں آپ کے ہم وطن اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے خلیفۂ اوّل میر محمد نعمان کشمیؒ برہانپور میں مقیم تھے اس لئے آپ قدیمی تعلقات کی بنا پر سیدھے ان کی خدمت میں جا حاضر ہوئے۔ آپ نے سلوک کی ابتدائی منازل میر موصوف کی نگرانی میں طے کیں اور پھر ان ہی کے مشورہ سے سنہ ۱۶۲۱ء میں سرہند جا کر حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور دو سال تک سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہے۔ آخری ایامِ زندگی میں جب حضرت مجدد صاحبؒ نے عزلت اختیار کی تو صاحبزادوں کے علاوہ جن خاص خاص مریدوں کو ان کے حضور میں باریابی کی اجازت تھی ان میں خواجہ محمد ہاشمؒ کا نام بھی آتا ہے۔ جس تن دہی اور خلوص سے آپ نے اپنے مرشد کی خدمت کی اس کا ثبوت حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور ان کے صاحبزادوں کی تحریروں میں عام ملتا ہے۔ اسی خلوص نیت کی بنا پر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی وفات سے سات ماہ قبل آپ کو

خلافت دے کر برہانپور روانہ کیا۔ آپ نے وہاں پہنچتے ہی بحکم مرشد رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا اور جلد ہی خاص و عام میں مقبول ہوئے۔ تا حال آپ کا مزار پُر انوار، جو سیوا سدن کالج کے احاطہ میں ہے، مرجع خلائق ہے۔ راقم السطور نے جولائی سنہ ۱۹۶۸ء میں مولوی معین الدین صاحب، استاذ سیوا سدن کالج، کی معیت میں مزار پر حاضری دی اور کتبہ کی عبارت نقل کی جو درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مزار قدس خواجہ ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ ہاشم حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کے مرید اور خلیفۂ خاص تھے۔ آپ شہر کشم علاقۂ بدخشاں کے باشندے تھے۔ سنہ ۱۰۲۹ ہجری میں دار السرور برہانپور تشریف لائے اور مجددیہ سلسلے کے ایک بزرگ حضرت میر محمد نعمان بدخشی رحمۃ اللہ علیہ سے فیض روحانی حاصل کیا۔ سنہ ۱۰۳۱ھ میں سرہند شریف جا کر مجدد صاحب سے مقامات سلوک کی تکمیل کی۔ واپسی پر برہانپور میں مع اہل و عیال سکونت اختیار کی۔ سنہ ۱۰۴۵ ہجری آپ کا سن وفات ہے۔ پہلے آپ کا مزار اقدس عیدگاہ کے قریب پانڈہ رول ندی کے کنارے پر تھا۔ سنہ ۱۲۷۳ ہجری میں سیلاب کی وجہ سے مزار شریف کے منہدم ہونے کا خطرہ تھا اس لئے خود خواجہ صاحب نے عالمِ خواب میں شہر برہانپور کے ایک بزرگ محمد طاہر صاحب کو مزار شریف کے دوسری جگہ منتقل کرنے کی ہدائت فرمائی۔ حسب ارشاد آپ کے جسم اطہر کو موجودہ مقام پر دفنایا گیا۔ حضرت خواجہ ہاشم صاحب کے مزار اقدس کے پاس ہی آپ کے فرزند ارجمند حضرت میر محمد قاسم اور دختر نیک اختر بی بی صفیہ کے مزارات بھی ہیں اور آپ کے خلیفۂ خاص حضرت شاہ عبد اللطیف رحمۃ اللہ حصاری کی قبر بھی ہے۔ خواجہ ہاشمؒ درویش باصفا ولی کامل اور

عالم و شاعر تھے آپ کی تصانیف مکتوبات امام ربّانی جلد سوم اور کتاب زبدۃ المقامات فارسی مطبوعہ ہیں، کلیات نظم فارسی کا قلمی نسخہ ملّا فیروز پارسی کے کتب خانہ آر، کے، کاما لائبریری بمبئی میں محفوظ ہے۔

مکتوبہ مورخہ ۴ر ربیع الاول ۱۳۸۷ھ ہجری مطابق ۱۴ر جون ۱۹۶۷ء

خواجہ محمد ہاشمؒ نے شعر و سخن کا بڑا عمدہ ذوق پایا تھا۔ آپ کے دیوان کے قلمی نسخے لندن، ایڈنبرا، کلکتہ، حیدرآباد اور علی گڑھ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے زبدۃ المقامات میں جابجا اپنے اشعار اور رباعیات نقل کی ہیں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو غزل، مثنوی اور رباعی کہنے پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ آپ کے اسی ذوق کے پیش نظر آپ کے مرشد نامدار حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات کی تیسری جلد کی ترتیب آپ کے ذمہ سونپی تھی۔ آپ کی علمیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ حضرت مجدد صاحبؒ کی حیات ہی میں ان کے صاحبزادوں نے ان کی سوانح حیات اور ان کے کلمات شریفہ اور انفاس لطیفہ قلمبند کرنے کے لئے آپ کا انتخاب کیا اور جس محنت و کاوش سے آپ نے یہ خدمت انجام دی اس کا منہ بولتا ثبوت خود زبدۃ المقامات ہے۔

زبدۃ المقامات

کتاب کا اصل نام – برکات الاحمدیہ الباقیہ – ہے لیکن یہ اپنے تاریخی نام زبدۃ المقامات سے مشہور ہے۔ تاہم اس سنہ کے بعد بھی اس میں ترمیم اور اضافہ ہوتا رہا۔ ایک جگہ آپ نے خواجہ حسام الدین کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے "اب سنہ ۱۰۴۰ھ ہجری ہے۔ آپ کی عمر شریف ساٹھ سال کو پہنچی ہے"۔ اس کتاب کی علمی قدر و قیمت یہ ہے کہ اس میں آپ نے حضرت امام ربانیؒ

کے وہ فوائد جو مکتوبات میں نہیں آسکے ان کے صاحبزادوں کی فرمائش پر قلم بند کر دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے اسے ایک طرح سے مکتوبات کا تکملہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ اس کتاب کے حصۂ اوّل میں آپ نے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے سوانح حیات، ملفوظات اور مکتوبات کے اقتباسات بھی تحریر فرمائے ہیں اس لئے اسے خواجہ باقی باللہ کی پہلی سوانح عمری بھی سمجھنا چاہیئے۔ چونکہ خواجہ بزرگ کا انتقال آپ کے ورودِ ہندوستان سے کئی سال پیشتر ہو چکا تھا اس لئے آپ نے ان کے متعلق معلومات ان کے خلفاء اور متوسلین سے فراہم کی تھیں۔ خواجہ بزرگ کے حالات جس شرح و بسط کے ساتھ اس کتاب میں ملتے ہیں ویسے کسی اور تذکرہ میں نہیں ملتے اس طرح اس کتاب کی علمی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں خواجہ محمد ہاشمؒ کے بعد آنے والے جتنے بھی تذکرہ نویسوں نے خواجہ بزرگ کے حالات تحریر فرمائے ہیں ان سب کا ماخذ زبدۃ المقامات ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آن   ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

خواجہ باقی باللہؒ کے دونوں صاحبزادوں کے حالات جس تفصیل کے ساتھ زبدۃ المقامات میں ملتے ہیں ویسے کسی دوسری کتاب میں میری نظر سے نہیں گزرے۔ خواجہ محمد ہاشمؒ کے پاس خواجہ کلاں عبید اللہؒ کے مکتوبات کافی تعداد میں موجود تھے اور آپ کے خیال کے مطابق یہ بڑے "فصیح و بلیغ" تھے۔ خواجہ خرد عبد اللہؒ کے متعلق بھی بہت سی اہم معلومات اسی کتاب میں ملتی ہیں۔

فوائدِ علمی

زبدۃ المقامات کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مجدّد

الف ثانیؒ کی ایک نامکمل شرح عوارف المعارف خواجہ ہاشمؒ کی نظر سے گذری تھی، علاوہ ازیں آپ ان کی ایک "بیاضِ خاص" سے بھی متعارف تھے۔

خواجہ محمد ہاشمؒ نے خواجہ محمد سعیدؒ کی تعلیقات مشکوٰۃ المصابیح کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب میں آپ نے ان احادیث پر تحقیق کی تھی جو فقہ حنفی کا ماخذ ہیں۔

خواجہ ہاشمؒ نے ایک موقعہ پر "چراغ ہفت محفل خواجہ معصومؒ" کی ایک — بیاض — کا بھی ذکر فرمایا ہے جس سے آپ نے زبدۃ المقامات کی تالیف کے دوران استفادہ کیا تھا، آپ کے بیان کے مطابق اس بیاض میں اُنھوں نے حضرت امام ربانیؒ کے وہ اسرار و معارف قلم بند کر لیے تھے جو خلوتوں میں ان کی زبانِ گوہر افشاں سے سنے تھے۔ اب یہ بیاض ضائع ہو چکی ہے اگر کہیں موجود ہوتی تو عارضِ حور سے زیادہ دلکش ہوتی اور اصحابِ معرفت اور اربابِ دانش اسے حرزِ جان بنا کر رکھتے۔

زبدۃ المقامات کی ورق گردانی سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کے ایک خلیفہ محمد علانؒ نے جو حرم مکہ میں قیام پذیر تھے رشحات عین الحیات کا عربی میں ترجمہ کیا تھا اور اس کتاب کے مطالعہ کے بعد عراق و عرب میں بے شمار لوگ نقشبندیہ سلسلہ میں داخل ہوئے۔

خواجہ ہاشمؒ کے پاس خواجہ حسام الدین کے مکتوبات کا بھی ایک اچھا خاصا مجموعہ موجود تھا۔ علاوہ ازیں آپ نے خواجہ باقی باللہؒ کے بڑے صاحبزادے خواجہ عبید اللہؒ کے مکتوبات بھی محفوظ کر لیے تھے۔ آپ نے اپنے ہم وطن اور پیر بھائی خواجہ محمد صدیق کشمیؒ کے متعلق بھی تحریر فرمایا ہے

کہ اُنھوں نے مولانا رومیؒ کی مثنوی کی طرز پر ایک مثنوی حقائق صوفیہ کے موضوع پر لکھی تھی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے خسرو شیریں کی طرز پر بھی اپنی ایک یادگار چھوڑی ہے۔ مصنف چونکہ خود اہلِ علم تھے اس لئے دوسروں کے علمی آثار کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ بہت سی ایسی کتابوں کا ذکر فرما گئے ہیں جو اب ناپید ہیں۔

زبدۃ المقامات کے متعلق شیخ محمد اکرام صاحب ارمغان پاک میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب باسلیقہ فن سوانح نگاری کا ایک قابل قدر نمونہ ہے، اور اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک روحانی بزرگ کے حالات ہونے کے باوجود یہ خرق عادت واقعات سے قریب قریب خالی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عوام میں یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ آخری عمر میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ خود کو حضرت مجدد صاحبؒ کا طفیلی سمجھنے لگے تھے۔ نقشبندی حلقوں میں اس بات کا اس زور و شور سے پروپاگنڈا کیا گیا ہے کہ اب یہ بات خواص کے ذہنوں میں بیٹھ چکی ہے۔ زبدۃ المقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "افواہ" اس زمانے میں بھی عوام میں پھیل چکی تھی۔ ہمارے خیال میں یہ غلط فہمی اس وجہ سے پھیلی کہ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ انتہائے کمال کو پہنچے تو خواجہ بزرگؒ ان کا احترام کرنے لگے تھے اور یہ ایک فطری امر تھا۔ ہم نے خود اپنے زمانے میں دیکھا ہے کہ جب کسی شاگرد میں خاص قابلیت کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے تو اساتذہ بھی اس کا دل و جان سے خاص خیال رکھنے لگتے ہیں۔ بالکل اسی طرح خواجہ بزرگ اپنے مرید خاص کی قابلیت، استعدا

اور ترقیٔ مقاماتِ سلوک دیکھ کر ان کا خاص خیال رکھنے لگے تھے۔ خواجہ ہاشمؒ رقم طراز ہیں کہ بارہا خواجہ بزرگ، حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے کہ آپ جیسے لوگ ہماری صحبت، سے نکلے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر آپ رقم طراز ہیں کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ خواجہ بزرگؒ کے "یمن و برکت" سے درجۂ کمال کو پہنچے ہیں۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کے صاحبزادوں اور خلفا کا ایسا نظریہ نہ تھا کہ خواجہ بزرگؒ آپ کے طفیلی تھے۔ صرف چند کوتاہ بینوں کو خواجہ صاحب کے مزاج میں تواضع اور انکسار دیکھ کر یہ غلط فہمی ہو گئی تھی۔

دیوان

آپ کے دیوان کے متعدد نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری لندن کے نسخہ کی مائیکرو فلم میرے پاس موجود ہے اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے مجموعہ ابو محمد کا نسخہ میں نے بغور پڑھا ہے، اور اس میں سے کافی کچھ نقل بھی کیا ہے۔ علی گڑھ کا نسخہ شاہجہان کے آخری ایامِ حکومت میں ۱۰۶۶ھ میں ورطۂ تحریر میں آیا تھا۔ اس نسخہ کے ۱۸۵ اوراق ہیں اور ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں۔ دیوان کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

اگر بہر زقدس سرو باغ راستان آمد　　ستون بارگاہ بادشاہ لامکان آمد
الف بود و سر آغاز حروف ابجد ہستی　　نشان وحدت پروردگار بی نشان آمد

اس کے بعد حمد ہے اور اس کے بعد چند نعتیں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لکھی ہیں اور ان کے ابتدائیہ اشعار یہ ہیں۔

دلہا چہ بود خانہ سودائی محمدؐ　　جانہا صدفِ گوہر یکتائی محمدؐ

سلسلۂ اہلِ جنون موی محمدؐ　　محرابِ عبادت خمِ ابروی محمد
وحدت چہ بود غنچۂ خندانِ محمدؐ　　کثرت چہ بود زلفِ پریشانِ محمد
یوسف چہ بود زال خریدارِ محمدؐ　　عیسٰی کہ بود عاشقِ بیمارِ محمدؐ
اشیا نقطی چند ز اسلام محمدؐ　　این نامہ منور یافتہ از نامِ محمدؐ
اخلاقِ رسل جا کرہ آئین محمدؐ　　دینہا ہمہ منظر گی دینِ محمدؐ

اس کے بعد ایک چالیس ابیات کی مثنوی ہے جس کا مطلع ہے۔

چون جمالِ خواجہ بود اوّلِ بہار　　از گلستانِ ظہور کرد گذار

اس کے بعد ۹۹ رباعیات ہیں جن میں آپ نے احادیث منظوم کی ہیں۔ اس کے بعد ۴ غزلیات ہیں جن کے بعد ساقی نامہ مسمّی لبعبہ سیارہ مرغان آتشخور ہے، جہاں ساقی نامہ ختم ہوتا ہے وہاں خواجہ بہاءالدین نقشبندؒ کی منقبت ہے جس میں ۳۱ ابیات ہیں۔ اس کا مطلع ہے

بستہ از قدرت نقاشِ ازل نقشِ دگر　　کلکِ رنگین زبان بروزن لختِ جگر

اس کے بعد "قصیدہ در مدح حضرت شیخ احمد فاروقیؒ" ہے جس میں ۲۴۷ ابیات ہیں۔ قصیدہ کا مطلع ہے۔

سحر خفتہ بودم در آغوش خویش　　بر ہم دل و خواب خرگوش خویش

اس کے بعد ایک طویل نظم ہے اور پھر حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کی منقبت میں ۴۰ اشعار تحریر کیے ہیں۔ منقبت کے بعد میر محمد نعمانؒ کی خدمت میں ۱۳ ابیات کا ایک منظوم خط لکھا ہے جس میں تاخیر جواب پر معذرت چاہی ہے۔ اس کے بعد ۱۴۷ اشعار میں ایک درویش کا قصہ قلم بند کیا ہے، اور اس کے بعد غزلیات کا حصہ شروع ہوتا ہے جس میں ۲۵۰ غزلیات ہیں، پہلی غزل ہدیۂ قارئین ہے۔

بسملِ دلہا بود بسم اللہ عنوانِ ما　　بابِ دیوانگی موی سرِ دیوانِ ما
ہر الف الفی و ہر بی با ہزاران راز نہ　　شیخ ہمچو طفل حیران در دبیرستانِ ما
ہست ہر سطری ز ما ابروی معشوقِ سخن　　گوشۂ ابرو اشارتہای بی پایانِ ما
زان درین ابرو کجی بنمود گہ ہست ایما کہ نیست　　خود کجی در طبع و در گفتار و در پیمانِ ما
بسکہ در ہر لفظ ما صد معنی آواز کیست　　نقطۂ ما ہمچو پرکاراست سرگردانِ ما
حرفہا سیخ کباب و نقطہا جامِ شراب　　ہوش گیرد گوش چون حرفی رود ز خوانِ ما
ہر کہ دید آن خندۂ پنہان نمکہای دگر　　باید از زار نہفت و قصۂ پنہانِ ما
از ملاحت حرفِ ما بشکست بازارِ نمک　　کس نگیرد در قیامت جز نمکدانِ ما

رشحِ کلکِ ماست ہاشم سیل و دلہا پرِ کاہ
کافر از مومن نداند موجۂ طوفانِ ما

ایک دوسری غزل ملاحظہ فرمائیے :-

شب نہ تب کاہش بسوخت برگ نوا را　　سیلی خود کردہ ایم دست دعا را
رازِ نہانی بلب رساند دل امروز　　خوی کبوتر کہ داد بلبلِ ما را
خلق بمحراب ابروی او سجود دہد　　شیشۂ دل بشکند قبلہ نما را
بس رخ خواب آب دیدہ نشانی　　گوشش کنی گر شبی فسانہ ما را
بود صبای میان ما و تو جبریل　　حیرت این راز بست، پای صبا را

ہر چہ رسد ہاشم از جہانت مزن دم
راہ درین شہر نیست چون و چرا را

ایضاً

خیز تا جان[1] بہ رہگذار کنیم　　خویش را چشمِ انتظار کنیم

---

[1] شیخ محمد اکرام صاحب نے ارمغانِ پاک میں پہلا شعر یوں تحریر فرمایا ہے -
خیز تا جا بہ رہگذار کنیم　　خویش را چشمِ انتظار کنیم
اور شیخ صاحب نے خواجہ ہاشم کی جو غزل نقل فرمائی ہے اس میں پانچواں، چھٹا اور آٹھواں شعر غائب ہے -

تا بدامانِ آن سوار رسیم   هستی خویش را غبار کنیم
از تمنای می گرد راہ کسی   اشک را دُرِّ شاہوار کنیم
یوسفِ ما عزیزِ ہر شہریست   جست و جوش بہر دیار کنیم
جملہ عالم نوید وصل دہید   خویش را بر ہمہ نثار کنیم
حرفِ موی کنیم و خوش ہمہ را   چون خود آشفتہ روزگار کنیم
خلق محمل بکار دل بستند   ما ندانیم دل چکار کنیم

چون جرس سر بپای ناقہ نہیم   نوحہ بر جانِ بیقرار کنیم
از جگر قطرۂ بدیدہ بریم   مژہ را گلبنِ بہار کنیم

دُرِّ ناسبت نقطۂ ہاشم
گوش جوئیم و گوشوار کنیم

ردیف "س" کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے اس میں شیخ فخرالدین عراقیؒ کے کلام کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

از برہمن و شیخ ز کیشِ پدرانِ پرس   از عشق پرستان غم شیرین پسران پرس
گم شد ز شرابِ لبِ این مغ بچگان دل   بنشین خبرِ گم شدہ از گم شدگان پرس
تا کی طلبِ غنچہ تہی باد صبا چشم   این قصہ بہ لب بستہ ز خونین جگران پرس
ز افسانہ این طبع گران گوش گران کن   دستار سبک روحان از رطل گران پرس
رو خواب طرب از مژہ خار و خسک جو   بیداری آن خواب ز چشمِ نگران پرس
شد روز دلم شب چو بزلفِ تو نظر کرد   افسانہ این شب تو ز صاحب نظران پرس

پیدا شود از ظلمتِ شب روشنی شمع
ہاشم ہنر خویش ز عیبِ دگران پرس

ردیف "م" کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے :۔

چل سال رفت ورہ بحقیقت نیافتیم   زین اربعین نتیجہ طاعت نیافتیم
در عمر نوح شیوۂ طفلی ز ما نرفت   لقمان شدیم ونبض طبیعت نیافتیم
دیدم بجلد ولیس قران را بگریہ گفت   اینجا فراغ گوشہ عزلت نیافتیم
داؤد عشق دست بمضراب زود گفت   بہ زین کلید قفل شریعت نیافتیم
درکاخ ذرہ نہادیم پای فکر   کنزی دری بکوچہ حیرت نیافتیم
گنجست کش بسہولسان نخواندا ند کنج ،   گنجی فزول ز کنج قناعت نیافتیم

پس از سال آہ شکستیم تدب خویش
خوشتر ز درد ہیچ غنیمت نیافتیم

ردیف "ن" کی ایک غزل پیشِ خدمت ہے۔

باآب می رہائی آشنا کن   چو مستی کام ولب مارا دعا کن
نبوش ای شیخ می وز فیض مستی   چو می در شیشہ رقص بی ریا کن
ز مستی چون صراحی سر فرود آر   بعمرت سجدۂ بہرِ خدا کن
دہان شو چون قدح زین راز وامروز   بزرق گریۂ دی خندہا کن
تیمم بود زہد خشک چل سال   وضوا زمی کن وعمرت قضا کن
زخاکی گر بمی انیوان نگندی   بہ روچون مردمک در دیدہ جاکن
بی عیسٰی گہی رنجور دل باشی   بُن ہر مو را دار الشفا کن
من ای جان از لوام آخر از خویش   تو دانی خود جفا با خود وفا کن
فقیہہ از بہرِ من فتوی چہ جوئی   برو سامان لعنت دلبریا کن

بر از دل چو ہاشم لب کشاید
لب ہر مُو تو بہر ثار ثنا کن

غزلیات کے بعد ۷۵۴ رباعیاں ہیں جن میں سے چند ہدیۂ قارئین ہیں۔

رُباعی

شمع شب غم کاشانهٔ تست   در کعبه روم قبلهٔ من خانهٔ تست
از بسکه دلِ سوختهٔ دیوانهٔ تست   پروانهٔ آن شوم که پروانهٔ تست

ولہ

جانا سمت قبله بجز سوی تو نیست   محراب جهانیان جز ابروی تو نیست
دیدم سواد اعظم ملتها   سوگند بموی تو که موی تو نیست

ایضاً

انصاف بده ای فلک تلخ مذاق   رعد تو نکوست یا نوای عشاق
وین برق تو به یا نفس سوختگان   وآن ابر تو خوش یا مژه اہل فراق

ولہ

لعل تو شرابی که ملک تشنهٔ اوست   آبیست که در بحر سمک تشنهٔ اوست
ہر چند نمک تشنه بی آرد بار   آتشیست دران لب که نمک تشنهٔ اوست

ایضاً

ای دوست رخی بهجر کشتان بنما   وز لب نمکی بسینه ریشان بنما
سر رشتهٔ جمعیت دل می طلبم   یک تار از ان موی پریشان بنما

ولہ

چون یار بدست باز گیسو بکشاد   صد نافه چین ز چین ہر مو بکشاد
بشکست ہزار دل چو خم واز زلف   بکشاد ہزار جان چو ابرو بکشاد

ایضاً

ہاتم بره غم شو که مسرت اینست   خاک رهِ عشق باش عزت اینست
یارا ہدف تیر جفا ساخت دلت   مخروش نشان محبت اینست

ایضاً

جسمِ من و چشمِ تست بیمار ای دوست   مژگانِ من و تیغ خونبار ای دوست
برباد ترا الوی و مرا خرمنِ صبر   آشفتہ ترا موی و مرا کار ای دوست

رباعیات کے بعد ایک طویل غزل ہے جس کا عنوان ہے "غزل مشتمل بر بیان دوازدہ مقام و بلبیت و چہار شعبہ و شش آوازہ و اوقات ہر یک و انواع تغنی"۔

اس کے بعد تین اشعار ہیں جو آپ نے اپنے دادا کو لکھ کر بھیجے تھے۔

ان کے بعد چار اشعار میں حضرت مجدد صاحبؒ کے نام کے "رموز" بیان کیے ہیں۔ ان کے بعد ۱۵ ابیات میں شجرۂ نقشبندیہ منظوم کیا ہے۔ ان کے بعد دو ابیات میں خواجہ امکنگیؒ، تین ابیات میں خواجہ باقی باللہؒ اور ۲۵ ابیات میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تاریخ ہائے وفات نکالی ہیں۔ اس کے بعد ۶۳ اشعار میں حضرت مجدد الف ثانی کی عمر کے لحاظ سے ۶۳ تاریخہائے وفات نکالی ہیں اسی طرح سات دیگر اشعار سے مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں دو رباعیاں بھی لکھی ہیں جن سے حضرت کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ اس کے بعد ۴ اشعار میں مکتوبات امام ربانی کے دفتر اوّل کی تاریخ تدوین کہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کہنے میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا اور آپ نے مندرجہ بالا بزرگوں کے علاوہ ان بزرگوں کی تاریخیں بھی کہی ہیں۔

صاحبزادہ محمد صادقؒ، خواجہ محمد عیسیٰؒ۔ سید مبارکؒ۔ علم اللہ محدثؒ۔ مولانا دانش سند بدخشانیؒ۔ میر مومن بلخیؒ، شیخ طاہر لاہوریؒ، میر عبداللہ احرارؒ، قاضی شکرؒ، مولانا معصومؒ، والد خود مولانا محمد قاسمؒ، خواجہ عثمانیؒ، شیخ حسن قادریؒ، سید محمودؒ عصمت اللہ لاہوریؒ اور خانخاناں۔

ان کے مربیِ خاص میر محمد نعمانؒ نے ایک حوض بنوایا تو آپ نے تاریخ کہی، شاہجہان کے جلوس کی تاریخ کہی، اسی طرح قصرِ شاہجہانی، جامع مسجد شاہجہانی، مسجد خانجہانی، مسجد فخرالدین احمد اور تجدید مسجد برہانپور کی تاریخیں کہی ہیں۔

مرثیہ گوئی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ آپ کے دیوان میں مراثی کثرت کے ساتھ ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادقؒ جو آپ کے ورود ہندوستان سے پیشتر ہی وصال فرما چکے تھے، ان کا مرثیہ بھی آپ نے بڑے زوردار الفاظ میں لکھا ہے۔

چشمم براہ ماندہ و گوشم ببانگ در   کس نیست تا خبر دہد از یار نوسفر
گفتم نویسمش غم ہجران سنان کلک شکست   بسمل شدند جملہ مرغان نامہ بر
از ہر مسام آہ و ز ہر موی خون روا   ہجران اوست آتش و ماہیہای تر
شبہا نسانہ غم او با خیال او   گویم کہ جز خیال ندارد باو گذر
چون نور شمع از تہ قندیل جسم او   باشد ز زیر خاک بہ دیدہ جلوہ گر
شمع مزار او ہمہ نور غفور بود   دلہای زائران در شش غرق نور بود

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وصال پر آپ نے ایک رُباعی کہی جس کے آخری مصرعہ سے مادۂ تاریخ ۱۰۳۴ھ برآمد ہوتا ہے۔

تا عیسی جانہا بشد از عالم خاک   دلہا شدہ خون پیرہن یوسف چاک
چون رفت بسوی روضہ پاک بہشت   تاریخ وصال او بگو روضہ پاک

ایضاً

بہار باغ عرفان ابر رحمت   کزین گلشن بتعجیل صبا رفت
مگر صبح قیامت سر برآرد   کہ از مشکوٰۃ دین شمع ہدیٰ رفت
چو شاہ اولیا عہد خود بود   خرد گفتا کہ شاہ اولیا رفت

اسی طرح آپ نے جن تراکیب مصرعوں سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تاریخ وفات نکالی ہے ان میں سے چند ایک قابلِ توجہ ہیں۔

سراج وجود طرف بست۔ خیر الاولیا نماند۔ معرفت مرد۔ احمد زبدۂ مشائخ بود۔ ابرِ نیسان رحمت بود، شہسوار محبت بود، شمسِ حقیقت بود۔ شاہِ طریقت بود۔ جانِ شریعت ہمہ اتباع سنت۔ جبلت تربیت، رفیع المراتب، خیر المناقب۔ مرآت جمال اللہ اکبر۔ بحار اسرار قرآنی۔ منور دین بالف ثانی۔ نور چمن زار عزت۔ سراج اکابر اہلِ سنت۔

اس کے بعد چار غزلیں ہیں جن کے متعلق آپ رقمطراز ہیں "این چہار غزل راکہ در اوّل بیت ہمان حرف آخر است در ردیف مشکل باشارہ شاہزاد ہای عالی مرتبہ مد ظلہم نظم نمودہ ام"۔ ان میں سے ایک غزل کا مطلع یہ ہے۔

ثابت از نیست در کار دلت کار عبث　　کیسہ چون ہست تہی رفتن بازار عبث

یہاں شاہزاد ہائے عالی مرتبہ سے شجاع اور اورنگ زیبؒ مراد لیے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ دونوں ہی برہانپور میں رہ چکے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ انھیں شاہزادوں کی بارگاہ میں بار تھا یا انھیں ان کے ساتھ عقیدت تھی۔

اس کے بعد پنج بند اور نو رباعیاں اپنے بھائی اسحاقؒ کے مرثیہ میں لکھی ہیں اور آخر میں ۲۹ اشعار اور دو رباعیوں میں اپنے بھائی محمد قاسم خضرؒ کا مرثیہ لکھا ہے۔ یہاں آکر دیوان ختم ہو جاتا ہے۔ میں ان کا ذکر ان کی رباعی پر ہی ختم کرتا ہوں۔

بس مستی من سست نہاد است اے دل　　کاہست تن و آہ تو باد است اے دل
آری بہ عنکبوت و شاد ر وانش　　نیمی نفس صرصر عاد است اے دل

* * *

فتوحات فیروز شاہی

ملّا نظام الدین احمد صاحب طبقات اکبری کی روایت ہے کہ سلطان فیروز تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) نے اپنے عہدِ حکومت کے اہم ترین واقعات اور اپنی اصلاحات کو "فتوحات فیروز شاہی" کے نام سے قلمبند کیا تھا۔ اس خیال سے کہ زمانہ کے ظالم ہاتھوں سے کہیں اس کی یہ مختصر سی تالیف ضائع نہ ہو جائے، سلطان نے اُسے لفظ بلفظ جامع مسجد فیروز آباد کے ہشت پہلو گنبد پہ کندہ کروا دیا۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی کہیے کہ سلطان فیروز تغلق نے اپنی تالیف کو زندہ و جاوید رکھنے کے لیے جس سنگین گنبد پہ کندہ کروایا تھا وہ تو مدت ہوئی تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ البتہ اس کی تحریر بے جان سے کاغذ پر آج بھی محفوظ ہے۔

فتوحات فیروز شاہی کے دو مخطوطے ہمارے علم میں ہیں، ان میں سے ایک مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے اور دوسرا برٹش میوزیم لندن میں۔ ۱۸۸۵ء میں دہلی سے کسی صاحب نے اسے شائع کیا تھا لیکن چھپنے کے ساتھ ہی یہ رسالہ چھپ گیا۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

نے بھی ایک بار اسے چھاپا تھا لیکن وہ ایڈیشن بھی اب ناپید ہے ۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر شیخ عبدالرشید نے ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کی مدد سے متن تیار کر کے علی گڑھ سے اسے بڑے خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا اور اس کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا لیکن اس رسالہ کے اردو ترجمہ کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی ۔

فتوحات فیروز شاہی کا مطالعہ فیروز شاہ کے ذہن کو سمجھنے کے علاوہ اس دور کے مذہبی افکار اور تصوف کے رجحانات کو جاننے کے لئے اشد ضروری ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا فتاح

اس خالق غفور و شکور کو حمد بے حد اور شکر بے حد سزاوار ہے جس نے مجھ بیچارے مسکین فیروز بن رجب غلام محمد شاہ بن تغلق شاہ کو احیاءِ سنّتِ رسول بیخ کنی بدعات ، دفعِ منکرات ، منع محرمات اور فرائض و واجبات ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی ۔ اس سیدّ کائنات ؐ پہ بے شمار رحمتیں ہوں جو رسم و رواج کے خاتمہ کے لیے مبعوث ہوئے تھے ۔ (حضورؐ کا فرمان ہے کہ "میں (جاہلیت کے) رسم و رواج ختم کرنے کے لئے مبعوث ہوا ہوں" ۔ ان پہ اور ان کی آل اور اصحاب پہ، جن کی مساعیٔ جمیلہ سے جاہلیت کے رسم و رواج ختم ہوئے تھے، درود اور سلام ہو ۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ۔

اما بعد ۔ اس معطی حقیقی کے انعام و اکرام کا اظہارِ شکر واجبات میں سے ہے ، اس لئے اس کا شکر احسن طریقے سے کرنا چاہیئے ۔ آدم علیہ السلام کی اولاد کے سردار (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور "اما بنعمت ربک فحدث" میں اسی

طرف اشارہ ہے)۔ اس مسکین و بیکس کو بھی خدا تعالیٰ نے بہت سی نعمتیں عطا کی ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں ان عطیاتِ الٰہی کا، جو اس نے مجھے بخشے ہیں، طاقتِ بشری کے مطابق شکر ادا کروں۔ شاید اسی طرح میں اس کے شکرگزار بندوں میں داخل ہو جاؤں۔

اس خالقِ رازق جل جلالہٗ و عم نوالہٗ کے عطیات میں سے ایک عطیہ یہ ہے کہ ملک ہندوستان میں (بہت سی) بدعتیں اور خلافِ شریعت باتیں مروج تھیں اور وہ عوام کی فطرت میں داخل ہو کر ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھیں اور لوگ راہ سنت سے منحرف ہو چکے تھے۔ حق تعالیٰ نے اس بیچارے اور مسکین بندے کو یہ توفیق بخشی اور اس نے بدعتوں، خلافِ شریعت اور حرام کاموں کے خاتمہ کو اپنا فرض سمجھا۔ اس نے (اس سلسلے میں) بڑی جدّوجہد کی یہاں تک کہ خدا کی مدد اور نصرت سے باطل رسموں اور خلافِ شرع امور کا بالکل خاتمہ ہو گیا، اور حق اور باطل میں تمیز ہو گئی۔

۱۔ اولاً یہ کہ زمانۂ ماضی میں مسلمانوں کا بہت سا خون بہایا جاتا تھا اور انھیں طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ (مجرموں کے) ہاتھ، پاؤں، کان اور ناک کاٹے جاتے، آنکھیں نکالی جاتیں، پگھلا ہوا سیسہ حلق میں انڈیلا جاتا، موگری کے ساتھ ان کے ہاتھ، پاؤں اور سینہ کی ہڈیاں توڑی جاتیں، جسم کو آگ کے ساتھ داغا جاتا، ہاتھ پاؤں اور سینہ میں میخیں ٹھونکی جاتیں، کھال اتاری جاتی، خاردار دُرّے لگائے جاتے اور پاؤں کاٹ دیے جاتے تھے۔ آرے کے ساتھ چیر کر دو ٹکڑے کر دینے کے علاوہ ان کا اور بھی کئی طریقوں سے مُثلہ کیا جاتا تھا۔ اُس اکرم الاکرمین نے اور ارحم الراحمین نے اس بندۂ امیدوارِ کرم کے دل میں القا کیا اور اسے ہمت عطا فرما کر اس کام پر مامور کیا

کہ مسلمانوں کا خون بلا وجہ نہ بہنے پائے اور انہیں کسی بھی قسم کی اذیت نہ پہنچنے دے اور کسی بھی شخص کا مثلہ نہ ہونے دے۔

بیت

چگونہ شکر این نعمت گزارم
کہ زور مردم آزاری نہ دارم

(اگلے سلاطین) یہ سب کام کیا کرتے تھے تاکہ لوگوں پر رعب بیٹھ جائے اور ان کا خوف دلوں پہ طاری ہو جائے اور انتظام سلطنت درست ہو جائے۔ وہ اس بات کی مثال دیا کرتے تھے۔

بیت

ملک را بر قرار می خواہی
تیغ را بی قرار خواہی داشت

خدا کے فضل سے، جو اس مسکین کے شاملِ حال ہے، وہ سختیاں اور ڈر اب مہربانی، کرم اور احسان میں بدل گئے ہیں اور خواص و عام کے دلوں میں خوف و رجا پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اب کسی کو قتل کرنے، مارنے پیٹنے، تکلیف دینے، سختی کرنے یا شکنجے میں کسنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ (مجھے) یہ سعادت خدا کے فضل اور عنایت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

نظم

کرم کن چو دست تو بالاتر است   کہ بخشایش از خشم والاتر است
ترا چون ز باری بزرگی عطاست   بہ تعجیل رسم سیاست خطاست
گر اول توقف کنی در قصاص   توان کشت او را کہ بدہی خلاص

ولیکن چو قالب پراگنده گشت نیارد به فرمان تو زنده گشت
نگه کن گہی مادر مہر سنج بر آن طفل خود چند بر داشت رنج
مگو "مرد کشتم صد اندر نبرد" یکی زنده کن تا ت خوانند مرد
چو بر خود نداری روا نشتری مکش تیغ بر گردن دیگری
مکوش اندر آن کز تنی خون رود که جان باز ناید چو بیرون رود
بخون ریز خلقی مشو فتنه دوست ترا نیز خونیست آخر به پوست
ہزار آفرین بر چنان رہنمون که پیش بزرگان نکو شد بخون
ز دولاب چرخ آن کسان راست آب که ایشان نیارد در خون شتاب
چو دشمن زبون گشت احسان بکن
به قدرت جوان مردئ جان مکن

خدا کی مدد سے (میں نے اپنے) دل میں اس بات کا تہیّہ کر لیا کہ ہر مسلمان کا خون اور ہر مومن کا جسم محفوظ و مامون رہے گا اور اگر کوئی شخص راہِ شریعت سے ہٹے تو کتاب اللہ اور قاضی کے فیصلے کے مطابق وہ جس سزا کا مستحق ہو، اُسے دی جائے۔ للہ الحمد علی توفیقہ

۲۔ اس کے علاوہ مجھ پر حق تعالیٰ وجل کا یہ فضل و کرم ہے کہ گذشتہ سلاطین کے القابات، جو جمعہ اور عیدین کے خطبوں سے حذف کر دیئے گئے تھے، اور ان مسلمان بادشاہوں کے نام، جن کی ہمت اور برکت سے کافروں کے شہر فتح ہوئے، جن کی فتوحات کے جھنڈے ہر ملک میں گڑے، صنم کدے برباد ہوئے، منبر تعمیر ہوئے، مسجدیں آباد ہوئیں، اعلائے کلمۃ الحق ہوا، اہلِ اسلام طاقتور اور حربی کافر ذمی بنے، بھلا دیئے گئے تھے، میں نے حکم دیا کہ حسبِ سابق سب کے نام اور اوصاف خطبہ میں پڑھے جائیں اور انہیں

دعائے مغفرت کے ساتھ یاد کیا جائے۔

بیت

چو خواہی کہ نامت بود جاودان
مکن نام نیک بزرگان نہان

۳۔ اس کے علاوہ اُس ہادیٔ عز اسمہٗ کی مدد سے، زمانۂ ماضی میں جو ٹیکس، غیر قانونی، غیر شرعی اور حرام طریقوں سے جمع کر کے بیت المال میں داخل کیے جاتے تھے، مثلاً منڈوی برگ[1]، دلالت بازار[2]، جنزاری[3]، امیری طرب[4]، گل فروشی[5]، جزیہ تنبول[6]، چنگی غلہ[7]، کتابی[8]، نیلگری[9]، ماہی فروشی، ندافی[10]، صابون گری، ریسمان فروشی، روغن گری[11]، نخود بریاں[12]، تہ بازاری، چھتہ[13]

---

[1] منڈی کا ٹیکس
[2] دلالوں پر ٹیکس
[3] بڑے قصائیوں پر ٹیکس
[4] ناچ گانوں اور تماشوں پر ٹیکس
[5] پھولوں کی فروخت پر ٹیکس
[6] پان پر ٹیکس
[7] غلہ پر چنگی۔

[8] ا۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب کے خیال میں کتابت پر جو ٹیکس لیا جاتا تھا اُسے کتابی کہتے تھے۔

اا۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے خیال میں یہ لفظ کتابی نہیں بلکہ کبابی ہے اور اس سے وہ ٹیکس مراد ہے جو کبابوں پر لگایا جاتا تھا۔

ااا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اسے کیالی پڑھا ہے، ان کے خیال میں یہ ٹیکس تولنے والوں پر عائد کیا جاتا تھا۔

[9] نیل کی صنعت پر ٹیکس
[10] دھننے پر ٹیکس
[11] تیل نکالنے پر ٹیکس
[12] بھنے ہوئے چنوں پر ٹیکس
[13] چھتہ پر ٹیکس، بقول بعض کپڑے کی چھپائی پر ٹیکس۔

قمارخانہ[114]، دادبیگی[115]، کوتوالی[116]، احتسابی[117]، قصابی[118]، کوزہ خشت پزی[119]، کرہی[120]، چرائی[121] اور مصادرات[122]، ان کے متعلق میں نے دیوانِ مالیات کو حکم بھیجا کہ انہیں فی الفور ختم کر دیا جائے اور جو سرکاری آفیسر ایسے ٹیکس لوگوں سے لے کر (خزانے میں) جمع کر لے اسے قرار واقعی سزا دی جائے ۔

بیت

دل دوستان جمع بہتر کہ گنج
خزینہ تہی بہ کہ مردم بہ رنج

(میں نے یہ بھی حکم دیا کہ) جو مال بیت المال میں جمع ہو وہ انہی مدوں سے آئے جنہیں شریعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روا رکھا ہے اور دینی کتب میں بھی ان کا جواز موجود ہو ، مثلاً زمین کا خراج، عُشر، زکوٰۃ وغیرہ یا غیر ہندوؤں سے لیا گیا جزیہ یا لاوارث جائداد ، یا مالِ غنیمت اور کانوں کی پیداوار کا خمس ، ایسی مدوں کی آمدنی جو کتاب اللہ کی رُو سے جائز نہ ہو، کسی طرح بھی بیت المال میں جمع نہ ہونے پائے ۔

۴۔ اس کے علاوہ یہ کہ اس سے پہلے یہ رسم اور عادت، جو سراسر بدعت تھی، رواج پا گئی تھی، کہ مالِ غنیمت کے چار حصے خزانے میں جاتے تھے اور

---

[114] جوا خانہ پر ٹیکس
[115] کورٹ فیس
[116] پولیس سے متعلق فیس
[117] احتساب کے متعلق فیس
[118] عام قصائیوں پر ٹیکس
[119] مٹی کے برتن اور اینٹیں بنانے پر ٹیکس
[120] دیہات کے مکان پر ٹیکس
[121] جانور چرانے پر ٹیکس ۔
[122] جرمانے ۔

پانچواں حصہ غازیوں کو دیا جاتا تھا، حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کیا جائے اور چار حصے غازیوں میں تقسیم کئے جائیں۔ یہاں سرکاری حکم کے مطابق اس کے برعکس ہو رہا تھا، تقسیم کا یہ حکم چونکہ شریعت کے مطابق نہیں تھا۔ اس لئے مالِ غنیمت کو جو بھی اپنے تصرف میں لاتا وہ فعل حرام کا مرتکب ہوتا تھا۔ اسی طرح اگر کوئی کنیز بچے کو جنم دیتی تو وہ حرامی ہوتا تھا۔ اسے روکنے کے لئے ہم نے یہ حکم دیا کہ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کیا جائے اور چار حصے غازیوں میں تقسیم کئے جائیں۔

۵۔ اس کے علاوہ یہ کہ شیعہ مذہب کے پیرو، جنہیں روافض کہتے ہیں، لوگوں کو مذہب رفض و تشیع کی دعوت دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے مذہب کے متعلق رسالے اور کتابیں لکھیں اور تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ حضرات خلفائے راشدین، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور تمام صوفیائے کرام رضی اللہ عنہم کو اعلانیہ برا بھلا کہتے اور لواطت کرتے تھے۔ وہ قرآن مجید کو "ملحقات عثمانی" کہتے تھے۔ میں نے ان سب کو گرفتار کر لیا، ان کی گمراہی اور ضلالت چونکہ ثابت ہو چکی تھی لہذا ان میں سے جو غالی تھے انھیں قتل کروا دیا اور دوسروں کو مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ اور تشہیر کر کے چھوڑ دیا۔ ان کی کتابوں کو سرِ عام جلا ڈالا، یوں، خدا کی عنایت سے، اس فرقہ کا شر مکمل طور پر ختم ہوا۔

۶۔ اس کے علاوہ یہ کہ ملحد اور اباحتی جمع ہو گئے اور وہ عوام کو الحاد اور اباحت کی طرف بلایا کرتے تھے۔ رات کے وقت وہ بلا تمیز محرم

و غیر محرم ایک خاص جگہ جمع ہوتے اور کھانا اور شراب سامنے رکھ کر کہتے کہ یہی ہماری عبادت ہے، اُنھوں نے ایک بت بھی بنا لیا تھا اور وہ لوگوں کو اس بات پہ مجبور کرتے تھے کہ وہ اُسے سجدہ کریں۔ اس رات وہ اپنی بیویوں، ماؤں اور بہنوں کو جمع کرتے اور پھر جس کا لباس ان کے ہاتھ لگتا اُسی کے ساتھ زنا کرتے۔ ان کے پیروں کو، جو شیعہ تھے، ہم نے سزا دی اور باقیوں کو قید کیا، جلاوطن کیا یا سزا دی، یہاں تک کہ ان کا شر اسلامی حکومت سے مکمل طور پر ختم ہو گیا۔

۷۔ اس کے علاوہ یہ کہ ایک طبقہ دہریت اور ترک و تجرید کے رنگ میں لوگوں کو گمراہ کر کے مرید بنا رہا تھا۔ وہ لوگ کلماتِ کفر بھی بکا کرتے تھے۔ ان گمراہوں کا مرشد احمد بہاری نامی ایک شخص تھا جو شہر (دہلی) میں رہتا تھا۔ بہاریوں کا ایک گروہ، جو اُسے خدا کہتا تھا، گرفتار کر کے پابزنجیر ہمارے سامنے لایا گیا۔ یہ لوگ نبی اکرمؐ کی شان میں گستاخیاں کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جس شخص کی نو بیویاں ہوں اُس کی نبوت کی بھلا کیا شان ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک مرید کہا کرتا تھا کہ دہلی میں خدا، یعنی احمد بہاری، ظاہر ہوا ہے۔ ان کے خلاف چونکہ اس بات کا ثبوت مل چکا تھا اس لئے ان دونوں کو میں نے گرفتار کر کے قتل کروا دیا اور دوسروں کو توبہ و استغفار کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے ان سب کو جلاوطن کر کے مختلف شہروں میں بھیج دیا تاکہ شر بھی منتشر ہو کر ختم ہو جائے۔

۸۔ اس کے علاوہ یہ کہ شہر دہلی میں ایک شخص رکن الدین، ملقب بہ مہدی نے کہا کہ میں مہدی آخر الزمان ہوں اور مجھے علم لدنی حاصل

ہو گیا ہے۔ میں نے کسی سے تعلیم اور فیض حاصل نہیں کیا اور مجھ کو تمام مخلوقات کے ناموں کا علم ہے جس کو سوائے آدم علیہ السلام کے اور کوئی پیغمبر نہیں جانتا۔ (اسی طرح) علم حروف کے راز جو کسی کو معلوم نہیں وہ مجھ پر ظاہر کر دیئے گئے ہیں۔ اس نے اس پر کتابیں لکھیں اور لوگوں کو گمراہی اور بے راہ روی کی دعوت دی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں "رکن الدین رسول اللہ" ہوں۔ بڑے بزرگوں نے میرے سامنے اس بات کی گواہی دی کہ وہ ایسا ہی کہتا ہے اور ہم نے اس سے یہی کچھ سنا ہے۔

جب اُسے ہمارے سامنے لایا گیا اور ہم نے اس کی گمراہی اور بے راہ روی کے متعلق استفسار کیا تو اس نے اس بدعت اور گمراہی کا اقرار کیا۔

علمائے دین نے کہا، "وہ کافر ہو چکا ہے اور اس کا خون بہانا جائز ہے۔

یہ فتنہ چونکہ اس کے خبث باطن کی وجہ سے اسلام اور اہلِ سنّت وجماعت میں سر اٹھا رہا ہے، اس لئے اگر اس کے دفعیہ میں، معاذ اللہ، تاخیر کی گئی تو اس کا یہ اثر ہو گا کہ بہت سے مسلمان گمراہ ہو کر دینِ اسلام سے نکل جائیں گے اس سے ایسا فتنہ پیدا ہو گا کہ بیشمار لوگ مارے جائیں گے۔"

ہم نے کہا کہ دنیا بھر کے علماء میں اس خبیث کی گمراہی اور فتنہ و فساد کا اعلان کیا جائے۔ اور ہر کس و ناکس کے کانوں تک یہ بات پہنچائی جائے۔

بعد ازاں علمائے دین اور آئمہ شریعت کے فتویٰ کے مطابق وہ جس سزا کا مستحق ہو اُسے دی جائے۔ اسے ان لوگوں کے ساتھ، جو اس کے معتقد، مددگار اور شریکِ کار تھے، قتل کیا گیا اور عوام میں خاص و عام نے جا کر اس کے گوشت، پوست اور اعضائے جسمانی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئیے۔ اس طرح اس کا شر ختم ہوا جو دنیا والوں کے لئے باعث

تنبیہ ہوا۔

خدا کی نصرت اور عنایت سے میں نے اس طرح کے شر اور اس قسم کی بدعات کا استیصال کیا اور حق تبارک و تعالیٰ نے اپنے اس مسکین بندے کو یہ توفیق دی کہ وہ سُنّت کا احیا کرے۔ اس کے ذکر کی غرض محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے اس تحریر کو سُن کر یا پڑھ کر اگر کسی شخص کو اپنے دین کی فلاح مطلوب ہو تو وہ اسی طریقے پر عمل کرے اُسے اس کا اجر ملے گا، اور اُسے اس کارِ خیر کی طرف توجہ دلانے پر ہم بھی داخلِ ثواب ہوں گے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

۹۔ اس کے علاوہ یہ کہ ملک گجرات میں عین ماہرو کے غلاموں میں ایک شخص شیخ بن بیٹھا اور اس نے بہت سے لوگوں کو اپنا مرید بنا لیا اور "انا الحق" کا نعرہ لگانے لگا۔ وہ اپنے مریدوں سے کہا کرتا تھا کہ جب میں "انا الحق" کہا کروں تو تم "تو ئی، تو ئی" کہا کرو۔ وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ میں وہ بادشاہ ہوں جس کو موت نہیں آتی۔ اس نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں کلماتِ کفر مندرج تھے۔ اُسے زنجیروں سے جکڑ کر ہمارے سامنے لایا گیا۔ اس کی گمراہی چونکہ ثابت ہو چکی تھی اس لئے ہم نے اُسے قتل کروا دیا اور اس نے جو رسالہ لکھا تھا وہ ہم نے جلا دیا۔ اس طرح خدا پرست مسلمانوں کے درمیان سے یہ فتنہ ختم ہوا۔

۱۰۔ اس کے علاوہ یہ کہ ایک رسم اور عادت، جس کا اسلام میں کوئی جواز نہیں لیکن شہر (دہلی) کے مسلمانوں کی فطرت میں داخل ہو چکی تھی، یعنی ایامِ متبرکہ میں عورتیں، ٹولیوں کی شکل میں، پالکیوں، بہلیوں اور ڈولیوں میں بیٹھ کر یا گھوڑوں اور گدھوں پہ سوار، فوج در فوج اور گروہ

درگروہ پا پیادہ شہر سے باہر نکلتیں اور مزارات پہ جائیں (آوارہ مزاج لونڈے اور اوباش جو خواہشاتِ نفسانی میں مبتلا اور صلاح و تقویٰ سے عاری ہیں ان کے پیچھے ہو لیتے، جو فتنہ و فساد ان کی حرکات سے ظاہر ہو سکتا ہے وہ دیدۂ بینا سے) پوشیدہ نہیں ہے۔ یوں بھی عورتوں کا اس طرح باہر نکلنا شرعاً منع ہے۔ ہم نے حکم دیا کہ کوئی عورت کسی مزار پہ نہ جائے اور اگر کوئی وہاں جائے تو اُسے سزا دی جائے۔ ان دنوں حق تعالیٰ کی عنایت سے کسی باپردہ مسلم خاتون یا عورت کی یہ مجال نہیں کہ باہر نکلے اور زیارت کو جائے۔ یہ بدعت بھی یوں ختم ہوئی۔

۱۱۔ اس کے علاوہ یہ بھی خدا کی دین ہے کہ ناپاک اور صنم پرست ہندوؤں نے جنہوں نے عقدِ ذمت میں آ کر جزیہ دینا قبول کیا ہے اور ان کے گھر بار محفوظ ہیں، شہر کے اندر اور گرد و نواح میں نئے بتخانے تعمیر کر لیے تھے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں چونکہ بتخانے تعمیر کرنے جائز نہیں ہیں اس لئے ہم نے حق تعالیٰ کی توفیق سے ان کی تعمیر کردہ غلط بنیاد عمارتوں کو برباد کر دیا۔ ہم نے ان کافروں کے سرغنے، جو دوسروں کو گمراہ کیا کرتے تھے، قتل کر ڈالے اور عام لوگوں کو مختلف قسم کی سزائیں دے کر متنبہ کیا۔ اس طرح یہ فساد بھی ختم ہوا۔

اس کے علاوہ ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ موضع ملوہ میں ایک تالاب ہے جسے کُنڈ کہتے ہیں اور وہاں بت خانے بنے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کا ایک طبقہ اپنے متعلقین کے ساتھ ایک خاص دن، اپنی عادت کے مطابق، اسلحہ سجائے ہوئے کافی ساز و سامان کے ساتھ سوار ہو کر نکلتا ہے۔ ان کی عورتیں اور بچے پالکیوں اور بہلیوں میں بیٹھ کر

ان کے ساتھ جاتے ہیں۔ وہ لوگ وہاں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوکر
بت پرستی کرتے ہیں۔ وہ اس فتنہ میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ دکاندار
قسم قسم کی کھانے پینے کی اشیاء لے کر وہاں پہنچ جاتے ہیں اور دکانیں
لگا کر فروخت کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک بے دین طبقہ نفسانی خواہشات
لے کر ان کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ جب یہ بات ہمارے کانوں تک پہنچی
تو ہم نے، خدا کی توفیق اور مدد سے اس فساد کو، جس کی وجہ سے دین
اسلام کو نقصان پہنچ رہا تھا ختم کرنے کا عزم کر لیا۔ جس دن وہ لوگ
وہاں جمع ہوتے ہیں ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہم نے حکم دیا کہ ان کے گروؤں
کو، جو انہیں ورغلاتے اور گمراہ کرتے ہیں، قتل کیا جائے اور عام ہندوؤں
کو اذیت ناک سزائیں دے کر (وہاں جمع ہونے سے) منع کیا۔ ہم نے
وہ بت خانہ برباد کر ڈالا اور اس جگہ ایک مسجد بنوائی اور (گرد و نواح
میں مسلمانوں کے) قصبات آباد کئے، ان میں سے ایک کا نام تغلق پور
اور دوسرے کا نام سالار پور رکھا۔ ان دنوں اس جگہ جہاں ناپاک
کافروں نے بتخانہ بنایا ہوا تھا۔ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسلمان سچے
معبود کے آگے سجدہ کرنے کے علاوہ، تکبیریں کہتے، اذانیں دیتے
اور جماعت کے ساتھ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ جس جگہ پہلے کافروں کے مسکن
ہوا کرتے تھے اب وہاں مسلمان بستے ہیں جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
کا ذکر اور ورد کرتے رہتے ہیں۔ اسلام کی (اس سربلندی) کے لئے اللہ
کی تعریف کرنی چاہیئے۔

علاوہ ازیں ہمیں یہ خبر ملی کہ موضع صالح پور میں بعض ہندوؤں نے
ایک نیا شوالہ تعمیر کر لیا ہے اور بت پرستی میں مشغول ہیں۔ ہم نے وہاں

بھی بت خانہ برباد کرنے کے لئے آدمی بھیجے اور جو لوگ گمراہی پر اصرار کر رہے تھے انہیں جلاوطن کر دیا۔

علاوہ ازیں یہ کہ گوھانہ نام کے ایک قصبہ میں ہندوؤں نے ایک نیا بتخانہ تعمیر کر لیا تھا اور مشرکوں کا ایک گروہ وہاں جمع ہو کر بت پرستی کیا کرتا تھا۔ انہیں گرفتار کر کے ہمارے پاس لائے۔ ہم نے حکم دیا کہ ان میں سے جو شخص مایۂ فساد ہیں ان کی گمراہی کا اعلان کیا جائے اور انہیں قصرِ شاہی کی ڈیوڑھی کے سامنے قتل کیا جائے۔ ہم نے یہ حکم دیا کہ کفر کی کتابیں، اور بت پرستی کے جو لوازمات وہ اپنے ساتھ لائے تھے انھیں بھی عوام کے سامنے مقتل میں ہی جلایا جائے۔ باقی لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے ساتھ (ان کاموں سے) منع کیا جائے تاکہ دوسروں کو تنبیہ ہو اور آئندہ دارالاسلام میں کوئی ذمی ایسی جرأت نہ کرے۔

۱۲۔ اس کے علاوہ یہ کہ زمانۂ ماضی میں یہ رواج تھا کہ دسترخوان پر طلائی اور نقرئی ظروف استعمال کئے جاتے تھے اور تلواروں کے دستوں اور ترکش پر سونے سے نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ ہم نے ایسا کرنے سے منع کیا اور اپنے اسلحہ کے نیام شکار شدہ جانوروں کی ہڈیوں سے بنوائے۔ ہم نے ان برتنوں کے استعمال کی عادت ڈالی جن کا استعمال شریعت کی رو سے جائز ہے۔

۱۳۔ علاوہ ازیں یہ کہ گذشتہ زمانے میں یہ رواج تھا کہ کپڑوں پر تصویریں بنائی جاتی تھیں اور یہ (کپڑے) شاہی دربار میں لوگوں کو خلعت کے طور پر پہنائے جاتے تھے۔ اسی طرح لگام، زین، سواری

کے جانوروں کے طوق، عود جلانے والی انگیٹھی، تھال، پیالہ، کوزہ، طشت، لوٹے، خیمے، پردے، تخت، کرسی، جملہ آلات اور ہتھیاروں پر تصویریں بنائی جاتی تھیں یا پھر مجسمے بنے ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور عنایت شاملِ حال ہوئی تو ہم نے حکم دیا کہ ان تمام اشیاء پر سے تصویریں اور مجسمے مٹا دیے جائیں اور جو نقش و نگار خلافِ شریعت نہیں اور ان کا بنانا جائز اور مباح ہے وہ بنائیں جائیں۔ جو مجسمے گھروں، دیواروں اور محلوں پر بنے ہوئے تھے، ان کے متعلق یہ حکم دیا کہ انہیں مٹا دیا جائے۔

۱۴۔ علاوہ ازیں یہ کہ اس سے پہلے اکثر بزرگوں کا لباس غیر شرعی یا ریشمی ہوتا تھا اور اس پر زردوزی کا کام کیا ہوا ہوتا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے ہم نے ایسا لباس اختیار کیا جو شریعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُو سے مباح ہے۔ زردوزی والے کپڑے اور زربفت کی کلاہ کا استعمال شروع کیا جس میں دستہ کی رسم کی چوڑائی چار انگشت سے زیادہ نہ ہو اور جو کچھ غیر شرعی اور ناجائز تھا یا جس کا استعمال شریعت میں منع تھا، اُسے ترک کر دیا۔ اسلام پر کاربند ہونے کے لئے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

۱۵۔ اللہ تعالیٰ نے اس مسکین بندے پر جو عنایات کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے ہمیں کارِ خیر کے لئے عمارات بنانے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ ہم نے بہت سی مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں اس غرض سے تعمیر کی ہیں کہ ان میں علما، مشائخ، زاہد اور عابد معبودِ حقیقی کی عبادت کریں اور بنانے والے کو دعائے خیر سے یاد کریں۔

ہم نے نہریں بھی کھدوائی ہیں اور درخت بھی لگوائے ہیں ہم نے ایسی اراضی، جس کا حصول شریعت کے مطابق ہے اور اس پر سبھی کا اتفاق ہے، نیز اس پر علمائے شریعت کا اجماع ہو چکا ہے (کہ اس کا حصول) ہر طرح کے شک و شبہ سے بالا ہے ہم نے اس کا ذکر صراحت کے ساتھ وقف نامہ میں کر دیا ہے کہ اس کی آمدنی بندگانِ خدا تک پہنچا دی جائے۔

۱۶۔ اس کے علاوہ خدا کے عطیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم نے گذشتہ سلاطین اور سابقہ امرا کی تعمیر کردہ عمارات کی جو امتداد زمانہ سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں مرمت کرائی یا انہیں نئے سرے سے تعمیر کر کے ان کو رونق بخشی۔ ہم نے ان عمارات کے استحکام کو اپنی تعمیر کردہ عمارات پر مقدم جانا۔

دہلی کی پرانی جامع مسجد، جو سلطان معزالدین سام کی تعمیر کردہ ہے، قدامت کی وجہ سے مرمت طلب تھی، ہم نے اس کی اس طرح مرمت کروائی کہ اب اس میں نئے سرے سے جان پڑ گئی ہے۔

سلطان معزالدین سام کا مقبرہ، جس کی غربی دیوار اور پرانے دروازے کے تختے بالکل بیکار ہو چکے تھے، نئے سرے سے بنوایا۔ اس کے دروازوں، کھڑکیوں اور زینوں میں معمولی لکڑی کی بجائے صندل کی لکڑی استعمال کی گئی۔

سلطان معزالدین کا مینارہ، جو آسمانی بجلی کے حادثہ سے گر گیا تھا (ہم نے) اُسے اپنی اصل بلندی سے بھی بالا اور پہلے سے کہیں بہتر بنوا دیا۔

حوض شمسی تک پانی لانے والی نالی کو بعض بددیانت لوگوں نے کہیں اُوپر ہی سے کاٹ کر پانی کی بہم رسانی روک دی تھی۔ ہم نے آب رسانی کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں دُور کر دیں اور بیجا تجاوزوں کی سرزنش کی۔

حوض علائی بے آب ہو کر مٹی سے اٹا پڑا تھا اور شہر کے لوگ اس میں کاشت کرنے لگے تھے۔ اُنھوں نے وہاں کنوئیں کھود لئے تھے اور ان کا پانی فروخت کرنے لگے تھے۔ ایک مدّت کے بعد ہم نے اُسے (دوبارہ) کھدوایا۔ اب یہ عظیم حوض سال بھر پانی سے بھرا رہتا ہے۔

اسی طرح سلطان شمس الدنیا والدین ایلتتمش رضی اللہ عنہ کا مدرسہ جس کے کئی کمرے منہدم ہو چکے تھے انہیں پہلے سے بھی کہیں بہتر بنوایا۔ مقبرہ کی تعمیر کے وقت صحن میں گچ کا پلستر نہیں ہوا تھا، وہ بھی کروا دیا۔ گنبد میں پتھر سے تراشے ہوئے زینے کا اضافہ کیا اور چاروں برجوں کے جو پشتے ٹوٹ رہے تھے انہیں درست کروا دیا۔

سلطان شمس الدین کے فرزند سلطان معزالدین کا مقبرہ جو ملک پور میں واقع ہے، اس طرح منہدم ہوا تھا کہ گویا وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ اس جگہ نئے سرے سے گنبد، چبوترہ اور چار دیواری تعمیر کی۔

سلطان رکن الدین بن سلطان شمس الدین کا مقبرہ جو ملک پور میں واقع ہے اس کے گرد چار دیواری بنوائی۔ اس کے علاوہ وہاں ایک نیا گنبد بنوایا اور خانقاہ تعمیر کروائی۔

سلطان جلال الدین کے مقبرہ کی مرمت کروائی اور وہاں نیا دروازہ تعمیر کیا۔

سلطان علاؤالدین کے مقبرہ کی مرمت کروائی اور اس میں صندل کے دروازے لگوائے (اس کے علاوہ) پیاؤ کی دیوار اور مدرسہ کے اندر جو مسجد ہے اس کی قبلہ رُخ دیوار کی نیو سے لے کر فرش تک مرمت کروائی۔

مقبرہ سلطان قطب الدین اور سلطان علاؤالدین کے فرزندوں، خضر خان، شادی خان، فرید خان، سلطان شہاب الدین، سکندر خان، محمد خان، عثمان خان اور اس کے پوتوں اور پڑپوتوں کے مزاروں کی از سرِ نو مرمت کروائی۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الحق والدین محبوب الٰہی قدس اللہ سرہٗ کے مزار کی جالیاں اور دروازے صندل کی لکڑی سے بنوائے اور سونے کی قندیلیں، سنہری زنجیروں کے سہارے، گنبد کے چاروں گوشوں میں آویزاں کیں۔ جماعت خانہ (کے نام سے ایک) نئی عمارت تعمیر کی پہلے وہاں ایسی عمارت نہ تھی۔

سلطان علاؤالدین کا وزیرِ اعظم ملک تاج الدین کافوری، جو باون ہزار سواروں کا سردار تھا، بڑی عقل اور فراست کا مالک تھا۔ اس نے ایسے بہت سے ملک، جہاں گذشتہ سلاطین کے گھوڑوں کے قدم بھی نہ پہنچے تھے، فتح کر کے سلطان علاءالدین کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ اس کا مقبرہ ڈھہ چکا تھا اور اس کی قبر زمین کے برابر ہو گئی تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ وہ حکومت کا خیرخواہ اور نمک حلال (ملازم) تھا۔ اس کا مقبرہ نئے سرے سے بنوا دیا۔

دارالامان میں، جہاں ہمارے مخادیم کے مزارات اور خوابگاہیں

ہیں۔ صندل کے دروازے لگائے اور اپنے ان آقاؤں کی قبروں پہ خانہ کعبہ کے دروازہ کے پردوں کے شامیانے لگوائے۔ ان مقبروں اور مدرسوں کی عمارتوں اور ان کی مرمت کے مصارف ان کے پرانے اوقاف سے پورے کئے۔ اس سے قبل جہاں آنے جانے والوں کا فرش، روشنی اور دوسرے لوازمات کے لئے، جو ایسی جگہوں کے شایانِ شان ہیں، رقم مقرر نہ تھی، گاؤں وقف کئے تاکہ ان کی آمدنی ہمیشہ وہاں خرچ ہوتی رہے

اسی طرح جہاں پناہ کو، جس کا بانی سلطان محمد شاہ مرحوم و مغفور میرا آقا اور ولی نعمت تھا اور جس کی خدمت میں رہ کر میں پلا اور بڑھا ہوں، آباد کیا۔ اسی طرح مملکت دہلی میں واقع گذشتہ سلاطین کے تعمیر کردہ تمام قلعوں کی مرمت کروائی۔

۱۷۔ اس کے علاوہ ہم نے مدرسوں اور مقبروں کے لئے، نیز گذشتہ سلاطین اور مشائخ عظام کے مزاروں پہ آنے جانے والوں کے لئے، اور ان بابرکت مقامات کے لئے ضروری سامان فراہم کرنے کی غرض سے ان کے پرانے وقف شدہ دیہات اور زمینوں کو برقرار رکھا، اور جن کے لئے اوقاف کی آمدنی یا اس کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا، ان کے حصے مقرر کئے تاکہ ہمیشہ کے لئے وہاں کارِ خیر جاری ہو جائے تاکہ آنے جانے والوں، اہل علم اور اہلِ معرفت کو وہاں آرام ملے اور وہ ہمیں اور انہیں دعائے خیر سے یاد کرتے رہیں۔

۱۸۔ اس کے علاوہ حق تعالیٰ نے ہمیں توفیق بخشی اور ہم نے شفا خانہ قائم کیا تاکہ خاص و عام میں سے جسے کوئی مرض لاحق ہو یا کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو وہاں پہنچ جائے۔ وہاں طبیب موجود رہتے ہیں۔ دوا اور (پرہیزی)

غذا کے مصارف اوقاف (کی آمدنی) سے دیئے جاتے ہیں۔ مقیم اور مسافر، رذیل اور شریف، آزاد اور غلام، ہر طرح کے مریض وہاں آتے ہیں۔ (شفاخانہ میں) ان کا علاج ہوتا ہے اور خدا کے فضل و کرم سے وہ صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

۱۹۔ اس کے علاوہ یہ کہ خدائے ذوالجلال اور قادرِ پُرکمال نے اس بندۂ عاصی کو توفیق بخشی کہ وہ لوگ جو میرے آقا سلطان محمد شاہ مرحوم و مغفور، خدا اس کی قبر کو معطر کرے، کے عہدِ حکومت میں تقدیرِ الٰہی سے مارے گئے تھے، یا جن لوگوں کی آنکھیں، ناک، ہاتھ اور پاؤں جیسے اعضا ضائع ہو گئے تھے ان کے وارثوں کو شاہ مرحوم و مغفور سے راضی کیا۔ ان میں سے ہر ایک کو مال و زر دے کر رضامند کیا اور (ان سے) خوشنودی کے خطوط، جن پر مستند شہادتیں ثبت تھیں، لے کر ایک صندوق میں بند کر کے دار الامان میں سلطان مرحوم و مغفور (خدا اس کی قبر کو روشن کرے) کی قبر کے سرہانے رکھوا دیا تاکہ خداتعالیٰ اپنے کرم بے پایاں سے میرے اس آقا اور مربی کو غریقِ رحمت کرے اور انہیں بھی اپنے (خاص) خزانے سے خوشی عطا کر کے میرے ولی نعمت کی طرف سے خوش کر دے۔

۲۰۔ اس کے علاوہ ایک عطیۂ الٰہی یہ بھی ہے کہ وہ دیہات یا زمین (جو لوگوں کے پاس) زمانۂ قدیم سے چلے آتے تھے لیکن گذشتہ دورِ حکومت میں ان سے چھن گئے تھے اور سرکاری دفتر کے ریکارڈ کی رو سے ان کے قبضہ اور تصرف میں نہ رہے تھے (ان کے متعلق ہم نے یہ حکم دیا کہ) جو کوئی ان کی ملکیت کا ثبوت شرعی عدالت میں پیش کرے وہ دیہات اور زمینیں یا جو کچھ بھی اس کی ملک ہو، اس پر قابض ہو جائے۔ سب بتوفیق اللہ

کے لئے ہیں اور اسی کی توفیق سے ہم اس فضیلت کے مقام پہ ہیں اور حقداروں کو ان کے حق مل گئے ہیں۔

۲۱۔ اس کے علاوہ ہمیں توفیق ملی کہ ذمیوں کو دینِ ہدیٰ کی طرف رغبت دلائیں۔ ہم نے یہ اعلان کیا کہ کافروں میں سے جو بھی کلمۂ توحید پڑھ کر دینِ اسلام قبول کرے گا، جیسا کہ شریعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں آیا ہے، اس سے جزیہ ہٹا لیا جائے گا۔ یہ آواز سب کے کانوں تک پہنچا دی اور ہندوؤں نے فوج در فوج اور گروہ در گروہ آ کر اسلام قبول کیا اور اسی طرح آج تک وہ ہر طرف سے آ کر ایمان لاتے ہیں، ان سے جزیہ ہٹا لیا جاتا ہے اور وہ انعام اور خلعت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ الحمد للہ رب العالمین۔

۲۲۔ اس کے علاوہ یہ بھی خدا کی عنایت ہے کہ ہمارے عہدِ حکومت میں خدا کے بندوں کا مال و دولت ہر طرح سے محفوظ و مامون ہے اور ہم یہ روا نہیں رکھتے کہ کسی کی ملکیت سے تھوڑی بہت یا معمولی اور قلیل مقدار بھی چھین لی جائے، بہت سے بہکانے والے ہمارے پاس آ کر چغلیاں لگاتے ہیں کہ فلاں تاجر کے پاس اتنے لاکھ اور فلاں عہدیدار کے پاس اتنے لاکھ کی رقم ہے۔ ہم نے سزا اور عقوبت سے چغلخوروں کی زبانیں بند کر دی ہیں تا کہ لوگ اس طبقہ کے شر سے محفوظ رہیں۔ بلاشبہ اب سبھی لوگ ہماری شفقت سے مجبور ہو کر ہمارے گرویدہ اور مخلص دوست بن گئے ہیں۔

قطعہ

نام نیکو طلب، کہ گنج سخا بہتر از گنج خواستہ صد بار
یک تمنا بہ کہ چند خرمن گنج یک دعا بہ کہ مال صد خروار

اس کے علاوہ یہ کہ خدا کی عنایت سے ہمارے دل میں فقیروں اور مسکینوں کی تواضع اور ان کی دلداری جاگزین ہو چکی ہے۔ ہم جہاں بھی کسی فقیر یا گوشہ نشین کو پاتے ہیں۔ اس سے ملنے کے لئے چل کر جاتے ہیں اور اس سے دُعا کی درخواست کرتے ہیں۔ (سنا ہے کہ) "سب سے اچھا امیر وہ ہوتا ہے جو فقیر کے دروازے پہ جاتا ہے"! کیا عجب کہ ہمیں بھی یہ رُتبہ مل جائے۔

۲۴۔ اس کے علاوہ یہ کہ سرکاری ملازمین میں سے جو بھی عمر طبعی پاتا اور اور بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہم اس کا وظیفہ مقرر کر کے اُسے سبکدوش کر دیتے ہیں۔ (وقتِ وداع) ہم اُسے یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اب آخرت کی تیاری میں مشغول ہو جاؤ اور جن منکراتِ دین و شرع کا جوانی میں ارتکاب کیا تھا ان سے تائب ہو کر دنیا سے مُنہ موڑ لو اور آخرت کے معاملات کی طرف دھیان رکھو۔

رُباعی

چون پیر شدی، کار جوان نتوان کرد
پیر لیست نہ کافری، نہان نتوان کرد
در ظلمت شب ہر آنچہ کردی کردی
در روشنیٔ روز ہمان نتوان کرد،

۲۵۔ اس کے علاوہ

قطعہ

طریق و رسم صاحب دولت آنست کہ بنوازند مردان نکو را،
دگر چون عمر آنکس منقضی شد نکو دارند فرزندان او را،

اشعار بالا کے مصداق جو ملازمانِ (شاہی) جاہ و منصب رکھتے ہیں، جب تقدیرِ الٰہی سے وہ اس دارِ غرور سے دارِ سرور میں چلے جاتے ہیں، ان کا جاہ و منصب ان کے فرزندوں کو اس طرح عطا کرتے ہیں کہ ان کے آبا کو جو عزت اور آسائش میسّر تھی اس میں کمی نہ ہو۔

قطعہ

رسم و آئین بادشاہان است　　کہ خردمند را عزیز کنند
وز پسِ عہدِ او، وفاداری　　با خردمند زادہ نیز کنند

۲۶۔ مزید براں، سب سے بڑی اور بہتر نعمت جو خداوند کریم جل جلالہٗ و عم نوالہٗ نے اس بندے کو بخشی ہے وہ خلیفۂ وقت ابنِ عمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت، دوستی، خیرخواہی اور فرمانبرداری ہے، اور یہی (ہماری) حکومت کے قانونی ہونے کا ثبوت ہے۔ کسی (حاکم) کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ خلیفہ کا خادم ہونے کا شرف حاصل نہ کرے اور اس کے دربارِ عالیہ سے منشور حاصل نہ کرے۔ خدا نے (ہمیں) اس کی توفیق دی اور اس کے متعلق (ہمارا) عقیدہ بہت پختہ ہے۔ دربارِ خلافت سے ہمیں اذنِ مطلق اور خلیفہ کی نیابت کا منشور عطا ہوا ہے اور اعلیٰحضرت امیر المومنین نے جس منشور میں ہماری بیعت کی قبولیت کا ذکر کیا ہے اس میں ہمیں "سید السلاطین" کے خطاب سے بھی مشرف کیا ہے۔ انہوں نے دربارِ خلافت سے پے در پے ہم پر جو نوازشات کی ہیں ان میں خلعت، عمامہ، علم، خاتم، تلوار اور قدم شریف شامل ہیں۔ ان سے دنیا والوں پر بزرگی اور شان ظاہر ہوتی ہے۔

یہ باتیں اس لئے لکھی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عنایات کا ذکر کیا جائے

اور اس کے انعام و اکرام کے ہزارویں حصّے میں سے ایک حصّہ اور کثیر میں سے حقیر سی بات کا شکر ادا کیا جائے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جو لوگ کارِ خیر اور نیکی کے کے خواہشمند ہیں، وہ اس کا مطالعہ کر کے یہ جان لیں کہ یہی مستحسن طریقہ ہے، اور پھر مروّت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اس پر کاربند ہونے کی سعادت حاصل کریں۔ انہیں اپنے اعمال کا ثواب اور ہمیں نیکی کی رغبت دلانے کا اجر ملے گا۔ نیکی کی طرف بلانا گویا نیکی کا کام کرنا ہے۔

تمام شد

اسلامی ہندوستان میں سکّوں پر شاعری

قرونِ وسطیٰ میں شعر و ادب اپنی منزلِ شباب پر تھے۔ فردوسی، عمر خیام، شیخ سعدی، خواجہ حافظ، انوری اور امیر خسرو اسی دور کی یادگار ہیں۔ انشاءپرداز کا کلام آناً فاناً ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیل جاتا تھا۔ جب تجارتی قافلے ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے تو علم و ادب کی متاعِ گراں بہا بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ ان ایام میں علم و ادب کو جو ترقی نصیب ہوئی اس کی نظیر آج تک نہ مل سکی۔ شاعری کا اثر جہاں علوم و فنون پر ہوا وہاں معاشی زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ برتنوں پر شعر، دسترخوانوں پر شعر، در و دیوار پر شعر، تلواروں کے دستوں پر شعر، کمربند پر شعر، قبروں پر شعر حتیٰ کہ سکّوں پر بھی شعر منقوش ہونے لگے۔

برصغیر ہند و پاکستان میں اسلامی شان و شوکت کا پرچم باقاعدہ طور پر سلطان شہاب الدین محمد غوری نے لہرایا۔ سکّہ و خطبہ اس کے نام کا جاری ہوا۔ سلطان نے جو سکے اس ملک میں جاری کئے ان پر سلطان کے نامِ نامی کے علاوہ هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق

لیظہرہٗ علی الدین کلہ منقوش تھا[10]۔ سبحان اللہ کیا پاک اور مقدس دین ہے جس میں شخصی اقتدار کی گنجائش ہی نہیں، اگر توصیف و تعریف ہے بھی، تو فقط اللہ تعالیٰ اور ہادیٔ برحق کی، حق تو یہ ہے کہ ہلالی نے یہ شعر کہہ کر خود ستائی کے لئے جگہ ہی باقی نہیں چھوڑی۔

محمدؐ عربی کآبروئے ہر دو سرا است
کسے کہ خاکِ درش نیست خاکِ بر سرِ او

اس لئے کسی نے اپنی مدح میں کلمات سکّوں پر کندہ کرانے مناسب ہی نہیں سمجھے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام کا ہی سکہ چلتا رہا۔ جب سلطان محمد غوری نے پرتھوی راج کو سنہ ۱۱۹۲ء میں شکست دے کر دہلی اور اجمیر پر قبضہ کر کے باقاعدہ حکومتِ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی تو بعض خوشامدیوں[11] نے سلطان کی خدمت میں عرض کی کہ قبلۂ عالم جو کام سلطان محمود غزنوی سترہ حملوں میں سرانجام نہ دے سکا وہ حضورِ والا نے دوسرے ہی حملہ میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ اب اس فتح کی خوشی میں جشنِ شاہانہ منعقد کرنا چاہیئے، چنانچہ اس تجویز پر عمل ہوا، اس جشن پر جو یادگاری سکے رائج ہوئے ان پر یہ بیت کندہ تھی۔

تا بدار الضرب مہر مہر و ماہ باد
سکۂ شہاب الدین محمد شاہ باد

مسٹر ٹائیلر نے سلطنتِ گجرات کے سکّوں پر انگریزی میں ایک کتاب

---

[10] ایڈورڈ ٹامس، دی کرانیکلز آف دی پٹھان کنگز آف دہلی، مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء، ص ۱۲

[11] نیلسن رائٹ، دی کوئن اینڈ میٹرولوجی آف دی سلطانز آف دہلی، مطبوعہ دہلی ۱۹۳۶ء، ص ۵

لکھی ہے جس میں آپ رقمطراز ہیں کہ غیاث الدین احمد شاہ والئے گجرات نے اول بار سرزمین ہند میں سکوں پہ شعر مضروب کروائے تھے، ان کا یہ قول حقیقت سے بعید ہے، غیاث الدین محمد شاہ کا عہد حکومت ۸۴۶ھ سے ۸۵۵ھ تک ہے اور سلطان شہاب الدین کو انتقال کئے اس وقت ڈھائی سو سال گذر چکے تھے، میرے قول کی تصدیق "تاریخ افغانان" بستیات جالندھر سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں اس سکے کی عبارت مع شعر موجود ہے۔

سلطان محمد غوری کے بعد کسی سلطان نے اپنے سکوں پہ شعر منقوش نہیں کروائے، محمد بن تغلق نے اپنے سکوں پہ جو عبارات کندہ کروائی تھیں وہ بذات خود اشعار کا لطف دیتی ہیں[۲]

المجاهد فی سبیل اللہ　　محمد بن تغلق شاہ
السلطان ظل اللہ　　محمد بن تغلق شاہ
الواثق بنصر اللہ　　محمد بن تغلق شاہ
الملک والعظمۃ للہ　　محمد بن تغلق شاہ

سلطان محمد بن تغلق کے بعد سلاطین کے عہد حکومت میں اس کی نظیر نہیں ملتی، مغلوں کی آمد کے بعد برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ میں

---

[۲] i۔ ایضاً، ص ۱۳۷،

ii۔ ابو الظفر ندوی، تاریخ گجرات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء ص ۴۰۱

iii۔ ڈاکٹر مہدی حسین، تغلق ڈائی نسٹی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۶۳ء ص ۵۰۹

iv۔ ڈاکٹر مہدی حسین، دی رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق، مطبوعہ لندن ۱۹۳۸ء ص ۲۲۲

v۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء ص ۳۸۲

ایک نئے باب کا آغاز ہوا، بابر کی تخت نشینی سے قبل ہندوستان میں جو معیاری سکہ رائج تھا اُسے ٹنکہ کہتے تھے، اب بھی بنگالی زبان میں روپے کو ٹکہ کہتے ہیں جو ٹنکہ کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ تیموریوں کے ہاں "شاہرخی" مُروّج تھی، اس کی چاندی نسبتاً خالص تھی اس لئے بے حد مقبول ہوئی۔ جب بابر تختِ ہندوستان پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے اس خوشی میں اپنے دِل پسند اور محبوب شہر کابل کے ہر چھوٹے بڑے فرد کو ایک ایک شاہرخی ارسال کی۔ اس کی تفصیل ابوالقاسم ہندو شاہ فرشتہ کی زبانی سنئے[۳۴]

> "برائے ہر یک از مردم شہر کابل از مرد و زن و از بندہ و آزاد و خورد و بزرگ و از فقیر و غنی یک شاہرخی کہ یک مثقالِ نقرہ باشد بسر شماری فرستادہ۔"

بابر کو موت نے مہلت نہ دی کہ وہ سکوں میں کوئی اصلاح کر سکتا۔ اس کے جانشین اور تساہل پسند بیٹے ہمایوں نے شیر خان کے مقابلہ میں سلطنت کی بازی ہار دی، شیر خان، شیر شاہ کے لقب سے سریر آرائے مسند ہوا اور اپنی نیک اصلاحات کے لئے نیک نام ہوا۔ اس نے شاہرخی کی بجائے روپیہ جاری کیا۔ روپیہ کے متعلق علامی ابوالفضل "آئین اکبری" میں رقمطراز ہے[۳۵]

> "در زمانِ شیر خان پدید آمد ---"

شیر شاہ، شاید کرنسی میں مزید اصلاحات کرتا لیکن اُسے بھی موت نے

---

[۳۴] فرشتہ، گلزارِ ابراہیمی، جلد اوّل، مطبوعہ بمبئی ۱۸۳۲ء، ص ۳۸۲

[۳۵] ابوالفضل آئینِ اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ء ص ۲۶

مہلت نہ دی، اور اس کے جانشینوں نے شیر شاہ کی جیتی ہوئی بازی ہمایوں کے مقابلہ میں ہار دی، ہمایوں بھی چند ماہ بعد پُرانے قلعہ کی مشہور عمارت شیر منڈل سے گر کر راہی ملک بقا ہوا اور اس کا بیٹا اکبر اس کا جانشین ہوا۔

مغلیہ حکومت کی نشاۃ ثانیہ دراصل اکبر کی تخت نشینی سے شروع ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس کے دربار میں ہر فن کے اربابِ کمال اکٹھے ہو گئے تھے جو شاید ہی کسی دوسرے تاجدار کو میسّر آئے ہوں، ابوالفضل، فیضی، عرفی، نظیری اور خانخاناں اسی دور کے آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے ہیں، دربار کا رنگ ہر چیز پہ غالب آگیا۔ کرنسی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ آئینِ اکبری میں ابوالفضل مغلیہ حکومت کی کرنسی کے ضمن میں رقمطراز ہے کہ بادشاہ کے حکم سے مولانا مقصود نامی ایک کاریگر نے ایک خاص وزن کی اشرفی تیار کی، اس کا نام "شاہنشاہ" تجویز ہوا۔ اس کا وزن ایک سو ایک تولہ نو ماشہ اور سات رتی تھا اس پہ اللّٰہ یرزق من یشآء بغیر حساب کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین کے اسمائے مبارک اور السلطان المعظم الخاقان المعظم خلد اللّٰہ ملکہ و سلطنتہٗ کے شاہی القابات بھی منقوش تھے، بادشاہ کو یہ سکے کچھ اچھے نہ لگے چنانچہ اس کے ایما پہ ملا احمد علی نے نئے ڈیزائن کا "شہنشاہ" بنا کر اس کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پہ ملک الشعراء کی یہ دو رباعیاں منقوش تھیں[۵]

خورشید کہ ہفت بحر از و گوہر یافت   سنگِ سیہ از پرتو آں جوہر یافت
کان از نظرِ تربیت او زر یافت   و آں زر شرف از سکۂ شاہ اکبر یافت

---

[۵] ایضاً، ص ۲۴

ایضاً

این سکہ پیرایہ امید بود   بانقش دوام و نام جاوید بود
سیمائے سعادتش ہمین بس کہ بدہر   یک ذرہ نظر کردہ خورشید بود

"شاہنشاہ" سے نصف قیمت کا سکہ "روپاس" کہلاتا تھا، اس کے تمام نقش و نگار تو "شاہنشاہ" ہی کی مانند تھے لیکن اس پہ مندرجہ ذیل رباعی کندہ تھی[۶۲]

این نقد روان گنج شاہنشاہی   با کوکب اقبال کند ہمراہی
خورشید بہ پرورش ازآن زوکہ بدہر   باید شرف از سکۂ اکبر شاہی

"روپاس" سے نصف قیمت کا سکہ "اٹمہ" کہلاتا تھا، نقش و نگار تو اس کے بھی "شاہنشاہ" جیسے ہی تھے مگر اس پہ یہ رباعی منقوش تھی[۶۳]

این سکہ کہ دست بخت را زیور باد   پیرایہ نہ سپہر و ہفت اختر باد
زرین نقدیست کار از و چون زر باد   در دہر روان نام شاہ اکبر باد

مسٹر ٹامس نے اکبر کے ایک خاص سکے کا ذکر کیا ہے جو فقط برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے، اس پہ جو شعر منقوش ہے وہ مسٹر لین پول نے بدقت یوں پڑھا ہے۔

ز دست از مہر اکبر بادشاہ نور
بہ آن نام شہ نورالدین علی نور

اکبر نے نصف صدی تک ہندوستان پہ حکومت کرنے کے

---

[۶۲] ایضاً، ص ۲۲   [۶۳] ایضاً، ص ۲۴

بعد ۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اس کی وفات کے وقت صرف آگرہ کی ٹکسال میں جو مال و دولت موجود تھا اس کی تفصیل جو خافی خان نے پیش کی ہے وہ یہاں لکھنی بے جا نہ ہو گی، خافی خان رقمطراز ہے[58]۔

> ”وہ کرور روپیہ را اشرفی یازدہ ماشہ و سیزدہ ماشہ و چہاردہ ماشہ سوائے اشرفیہائے کلان کہ از صد تولہ تا پانصد تولہ ہزار اشرفی در خزانہ موجود بود، و صد و ہفتاد و دو من طلائے غیر مسکوک و سہ صد و ہفتاد من نقرہ و یک من جواہر خاصہ کہ قیمت آن از سہ کرور روپیہ بود تجاوز نمودہ بود بر آمد۔“

اس سے ملک کی اقتصادی حالت کا اچھا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جہانگیر ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو سریر آرائے اورنگ ہوا۔ وہ مست الست بادشاہ تھا، فارسی ادب میں یوں تو سبھی تیموری حکمران بہت اونچا درجہ رکھتے تھے لیکن بقول علامہ شبلی مرحوم جہانگیر اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کی تزک فارسی ادب کی کتابوں میں سرِ فہرست شمار کی جاتی ہے، اس نے فن سکہ سازی میں اپنے باپ کو بھی مات کر دیا۔ تخت نشین ہوتے ہی بقول خافی خان اس نے یہ حکم صادر فرمایا[59]۔

> شبیہ بادشاہ را بر پارچۂ طلائے بوزنِ یک تولہ مسکوک ساختہ طرف دیگر صورت شیر کہ مرکوب آفتاب باشد نمایاں نمودہ، با امرائے مقرب و فدویانِ خاص دہند کہ باعزاز بر سرِ دستار یا روئے سینہ بجائے حرزِ جان

---

[58] خافی خان، منتخب اللباب، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء، ص ۲۴۳

[59] ایضاً۔ ص ۲۷۲

نگاہ مے داشتہ باشند" ان پہ یہ بیت بھی منقوش ہوئی۔

قضا بر سکۂ زر کرد تصویر
شبیہ حضرت شاہ جہانگیر

جہانگیر نے ۱۰۲۳ھ میں آگرہ کی ٹکسال میں ایک نیا سکہ مضروب کروایا، اس پہ یہ شعر منقوش تھا۔

حروف جہانگیر و اللہ اکبر ز روز ازل در ابد شد برابر

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک اور سکہ ڈھالا گیا۔ اس پہ یہ بیت کندہ تھی۔

شاہ سلطان سلیم شاہ اکبر
ملک الملوک سکہ زد بر زر

جہانگیر ۱۰۲۷ھ میں مانڈو سے ہوتا ہوا کھمبائت پہنچا تو گجرات کے صوبہ دار نے اس کی آمد کی خوشی میں نئے سکے ڈھلوائے جن پہ یہ بیت منقوش تھی۔

بزر این سکہ زد شاہ جہانگیر ظفر پرتو
پس از فتح دکن آمد چو در گجرات از مانڈو

اس واقعہ کے چھ سال بعد احمد آباد کی ٹکسال سے ایک اور سکہ جاری ہوا جس پہ یہ شعر کندہ تھا۔

الٰہی تا جہان باشد روان باد
بشرق و غرب مہر احمد آباد

ایک بار جہانگیر اجمیر گیا تو وہاں کے صوبہ دار نے اس کی آمد پہ جو سکے جاری کئے ان پہ یہ بیت منقوش کروائی۔

جہان فروز باجمیر گشت سکہ زر ز نور نام جہانگیر شاہ، شاہ اکبر

اس کے عہد میں الہ آباد سے جو سکے جاری ہوئے ان پر یہ شعر کندہ تھا۔

ہمیشہ زرِ سکہ الہ آباد
ز نام شاہ جہانگیر شاہ اکبر آباد

اسی طرح اس کے زمانے میں برہانپور سے جو سکے جاری ہوئے ان پر یہ بیت منقوش تھی۔

سکہ زد در شہر برہانپور شاہ دین پناہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابنِ اکبر بادشاہ

جہانگیر کے عہدِ حکومت میں اکبر نگر (موجودہ راج محل) میں بھی شاہی ٹکسال موجود تھی، وہاں سے جو سکے جاری ہوئے ان پر یہ شعر کندہ تھا۔

سکہ زر اکبر نگر زد شاہ گردون بارگاہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

اس ٹکسال سے ایک اور سکہ بھی جاری ہوا، اس پر یہ بیت منقوش تھی۔

روی زر را ساخت نورانی برنگ مہر و ماہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابنِ اکبر شاہ

۱۰۲۰ھ میں احمد آباد کی ٹکسال سے ایک سکہ جاری ہوا اس پر یہ بیت کندہ ہے:۔

زر احمد آباد را داد زیور
جہانگیر شاہِ شہنشاہ اکبر

اسی ٹکسال سے ایک اور سکہ جاری ہوا جس پر یہ بیت موجود ہے۔

سکہ زد در احمد آباد از عنایات الہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

اسی ٹکسال کا ایک اور سکہ بھی ملتا ہے جس پر یہ شعر موجود ہے ۔

بہفت کشور این زر ہمیشہ باد روان
ز نقش نام جہانگیر بادشاہ جہان

اتفاق سے اسی ٹکسال میں ایک اور سکہ ڈھالا گیا جس پر یہ شعر منقوش ہے ۔

مالک الملک سکہ زد بہ زر
سلیم شاہ سلطان شاہ اکبر

جہانگیر کو نور جہاں کے ساتھ جو محبت تھی اس کا ثبوت اس نے اپنے سکہ پر یہ شعر منقوش کرواکے رہتی دنیا تک باقی رکھا ہے[۱۰]

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنام نور جہان بادشاہ بیگم زر

”نور جہانی“ سکے اب نایاب ہو گئے ہیں، اس کے متعلق مؤرخین لکھتے ہیں کہ شاہ جہان نے تخت نشین ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ ایسے تمام روپے جن پر نور جہاں کا نام کندہ تھا، جمع کر کے پگھلا ڈالے تھے۔

سنہ ۱۰۱۹ھ میں جہانگیر نے آگرہ کی ٹکسال میں جو سکے ڈھلوائے ان پر یہ بیت منقوش کروائی جو بمشکل پڑھی گئی ہے ۔

در اسفندار مر این سکہ[۱۱] را در آگرہ زد بر زر
شہنشاہ زمان شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

اسی ٹکسال سے ایک اور سکہ جاری ہوا جس پر یہ بیت کندہ ہے ۔

---

[۱۰] ۔ ایضاً، ص ۲۰۸ [۱۱] ۔ وائٹ ہیڈ۔ کیٹلاگ آف دی کوئنز ان دی پنجاب میوزیم لاہور، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۴ء، ص ۱۲۸

در مہر آبان باگرہ سکہ زد ظل الہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر شاہ

آگرہ کی ٹکسال سے ۱۰۲۸ھ میں ایک اور سکہ جاری ہوا جس پہ یہ شعر منقوش ہے۔

یافت در آگرہ روئے زر زیور
از جہانگیر شاہِ شاہ اکبر

جہانگیر کے عہد کا ایک نایاب سکہ ملا ہے جو ۱۰۱۱ھ میں آگرہ کی ٹکسال میں مضروب ہوا تھا، اس پہ یہ بیت کندہ ہے۔

سکہ زد در شہر آگرہ خسرو گیتی پناہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

اسی طرح جہانگیر نے آگرہ کی ٹکسال سے ۱۰۲۰ھ میں ایک سکہ جاری کیا تھا، اس پہ جو شعر کندہ ہے وہ بدقت یوں پڑھا گیا ہے۔

بفزود دین زر آگرہ فروزان گشت چون اختر
ز نور سکہ شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

۱۰۲۶ھ میں مانڈو کے دارالضرب سے جو سکے ڈھل کر نکلے، ان پہ یہ بیت منقوش تھی۔

بنور جہانی دہد پہ تو چو مہر و ماہ
سکہ مندو ز نام جہانگیر شاہ

جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ میں نے ایک خاص موقعہ پہ یہ حکم دیا کہ خاص اوزان کے سکے ڈھالے جائیں۔ ان کے نام بھی خود ہی تجویز کیے۔ صد تولہ کی اشرفی "نورشاہی" پچاس تولہ کی اشرفی "نور سلطانی"

بیس تولہ کی اشرفی "نور دولت" دس تولہ کی اشرفی "نورِ کرم" پانچ تولہ کی اشرفی "رواجی" کے نام سے موسوم ہوئی، اسی طرح چاندی کی صد تولہ کی مہر "کوکب طالع" پچاس تولہ کی مہر "کوکب اقبال" بیس تولہ کی مہر "کوکبِ مراد" دس تولہ کی مہر "کوکب بخت" پانچ تولہ کی مہر "کوکب سعد" اور ایک تولہ کی مہر "جہانگیری" کہلانے لگی۔ دس تولہ اور اس سے بڑے سکوں پہ یہ بیت نقوش کروائی[۱۱]

بخطِ نور بر زر کانکِ تقدیر
رقم زد شاہ نورالدین جہانگیر

دوسرے رُخ پہ کلمہ طیبہ اور یہ بیت کندہ کروائی[۱۲]

شد چو خورشید این سکہ نورانی جہان
آفتاب مملکت تاریخ آن

جہانگیر کے عہد میں لاہور کی دارالضرب سے جو سکے جاری ہوئے ان میں سے ایک پہ یہ شعر منقوش ہے۔

ہمیشہ باد بر روئے سکہ لاہور
زنام شاہ جہانگیر شاہ اکبر نور

اسی، سال سے ۱۰۱۹ھ میں ایک سکہ جاری ہوا جس کی عبارت مسٹر وائٹ ہیڈ نے یوں پڑھی ہے۔

در اسفندار مراین سکہ در لاہور زد بر زر
شہنشاہ امم شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

---

[۱۱] جہانگیر، تزکِ جہانگیری، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء۔ ص ۵،
[۱۲] ایضاً۔

اسی سال کا اور اسی ٹکسال کا ڈھلا ہوا ایک اور سکہ بھی لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے جس پر یہ بیت منقوش ہے [۳۱۵]

در ماہ بہمن چو مہ انور شد زر لاہور،
بدور شاہ نورالدین جہانگیر ابن شاہ اکبر

اسی ٹکسال کا بنا ہوا ایک اور سکہؔ دستیاب ہوا ہے جس پر یہ شعر کندہ ہے:-

بدھر باد روان تا فلک بود در دور
بنام شاہ جہانگیر سکہ لاہور

اسی ٹکسال سے سنہ ۱۰۲۰ھ میں ایک اور سکہ جاری کیا گیا۔ جس پر یہ بیت منقوش ہے۔

مہ اردی بہشت این سکہ در لاہور زد بر زر
شہنشاہ زمان شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

لاہور کی ٹکسال سے سنہ ۱۰۳۰ ہجری میں ایک نیا سکہؔ جاری ہوا۔ اس پر جو بیت منقوش ہے وہ لاہور کے عجائب گھر کے فاضل کیٹیلاگر مسٹر وائٹ ہیڈ نے بدقت یوں پڑھی ہے۔

بماہ تیر در لاہور زد این سکہ را بر زر
ملکِ دین پناہ شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

---

[۳۱۵] . وائٹ ہیڈ، کیٹیلاگ آف دی کوئنز اِن دی پنجاب میوزیم لاہور مطبوعہ آکسفورڈ سنہ ۱۹۱۴ء، ص ۱۵۶

جہانگیر کے بعد اس کا بیٹا شاہجہان تخت نشین ہوا۔ یہ بڑے اچنبے کی بات ہے کہ اس کے سکوں پر شعر نہیں ملتے، شاہجہان کے بعد اورنگ زیب تخت نشین ہوا۔ اورنگ زیب کو شعر و شاعری سے فطرتاً نفرت تھی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کے سکوں پر یہ شعر منقوش ہے[۱۴]

سکہ زد در جہان چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

منوچی اپنی شہرۂ آفاق تالیف "سٹوریا ڈو موگر" میں لکھتا ہے کہ جب شاہ ایران کو اس شعر کا پتہ چلا تو اس نے فی البدیہہ کہا[۱۵]

سکہ زد بر قرص پنیر
اورنگ زیب برادر کش پدر گیر

اورنگ زیب نے ۳ مارچ ۱۷۰۷ء کو وفات پائی، تو سب سے پہلے اس کے بیٹے کام بخش نے اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہوئے جو سکّے جاری کئے ان پر یہ بیت منقوش تھی۔

در دکن زد سکّہ بر خورشید و ماہ
بادشاہ کام بخش دین پناہ

اس کے بھائی محمد اعظم نے جو گجرات کا گورنر تھا ۱۵ مارچ ۱۷۰۷ء کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر اس نے جو سکے جاری کئے ان پر یہ شعر کندہ تھا[۱۶]

---

[۱۴] سکہ در ذاتی مجموعہ مسکوکات راقم الحروف

[۱۵] منوچی، سٹوریا ڈو موگر، جلد دوم، مطبوعہ لندن ۱۹۰۷ء۔ ص ۱۳۱

[۱۶] ایضاً، جلد چہارم، ص ۳۹۹

سکہ زد در جہان بدولت وجاہ
بادشاہ ممالک اعظم شاہ

تیسرا بھائی محمد معظم کابل میں مقیم تھا۔ اس نے اپنے والد کی وفات کی خبر سنتے ہی دہلی کی جانب کوچ کیا، لاہور کے گورنر منعم خان نے معظم کی بروقت مدد کی۔ اسی اثنا میں معظم کا بیٹا عظیم الشان، جو بنگال کا صوبہ دار تھا، تیس ہزار فوج اور آٹھ کروڑ روپے لےکر باپ کی مدد کے لئے نکلا۔ دونوں نے ملکر اعظم کو آگرہ کے قریب شکست دی۔ اعظم مع اپنے دو بیٹوں، والاجاہ اور بیدار بخت کے میدان میں کام آیا۔ محمد معظم بہادر شاہ شاہِ عالم کے لقب سے تخت نشین ہوا، کام بخش کو بھی حیدر آباد کے قریب شکست ہوئی۔ شاہ عالم نے حکم دیا کہ آئندہ سکوں پر شعر کندہ نہ کئے جائیں۔

شاہ عالم تخت نشینی کے وقت بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ پانچ سال حکومت کرنے کے بعد وہ ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء کو راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ اس کا بیٹا جہاندار شاہ، اپنے بھائیوں عظیم، خجستہ اختر اور رفیع الشان کو موت کے گھاٹ اتار کر تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے سکوں پر یہ بیت کندہ کروائی۔

در آفاق زد سکہ چون مہر و ماہ
ابوالفتح غازی جہاندار شاہ

اسے صرف گیارہ ماہ حکومت کی بہار دیکھنی نصیب ہوئی۔ بادشاہ گروں نے اس کی بجائے فرخ سیر کو بادشاہ بنایا۔ اس لئے یہ بیت اپنے سکہ کی زینت بنائی۔

سکہ زد از فضلِ حق بر سیم و زر
بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

مسٹر اروِن لکھتے ہیں کہ میر جعفر زٹلی نے نارنول میں اس خبر کو سنتے ہی کہا[ٹلہ]

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
پادشاہ دانہ کش فرخ سیر

بعض روایتوں میں دانہ کش کی بجائے پشہ کش بھی دیکھنے میں آیا ہے، بادشاہ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو اس نے فوراً میر جعفر زٹلی کی گرفتاری کے احکام صادر کیے، میر صاحب قبلہ دہلی لائے گئے جہاں انہیں تختہ دار پہ چڑھایا گیا، بیچارے مذاق ہی مذاق میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

فرخ سیر کو بادشاہ گروں نے معزول کر کے نکو سیر کو سریر آرائے مسند کیا۔ اس نے جو روپے جاری کئے ان پہ یہ شعر تھا۔

بزر زد سکہ صاحب قرانی
شہ نکو سیر تیمور ثانی

بادشاہ گروں کی اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں مگر وہ پوری نہ ہو سکیں، اب ان کی نظر انتخاب رفیع الدرجات پر پڑی، اس نے تخت نشین ہوتے ہی جو روپے جاری کئے ان پہ یہ شعر منقوش تھا[شلہ]

[ٹلہ] اروِن، لیٹر مغلز، مطبوعہ کلکتہ (سرکاری ایڈیشن)، ص ۳۹۹

[شلہ] وائٹ ہیڈ، ص ۳۱۱

سکہ زد بہند باہزاران برکات
شاہنشہ بحر و بر رفیع الدرجات

بادشاہ نے اشرفیوں پہ کوئی دوسری بیت منقوش کروانا چاہی تو فتح خان افضل نے اس کی فرمائش پہ یہ بیت کہی جو پسند خاطر ہوئی ۔

سکہ زد شاہ رفیع الدرجات
مہر مانند بایمین و برکات

رفیع الدرجات بھی چند روز بہار جانفزا دکھا کر رخصت ہوا تو اس کی جگہ رفیع الدولہ شاہجہان ثانی کے لقب سے تخت طاؤس پہ بیٹھا ۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی جگہ بادشاہ گردل نے روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے تخت ہندوستان پہ بٹھایا ۔ اس نے اس موقع پہ جو سکے جاری کئے ان پہ یہ شعر منقوش تھا ۔

سکہ زد در جہان زلطف الہ
بادشاہ زمان محمد شاہ

محمد شاہ کے زمانے میں ہی ابراہیم نامی ایک غاصب نے چند روز کے لئے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اس موقع پہ اس نے جو سکے جاری کئے ان پہ یہ بیت کندہ کروائی ۔

سکہ زد در جہان بفضل کریم
شاہ شاہان محمد ابراہیم

۳۹ روز کی حکومت کے بعد اسے شکست فاش ہوئی ، محمد شاہ حسب سابق حکومت کرنے لگا ۔ اس نے بادشاہ گردل کا زور توڑا اور ۱۷۴۸ء تک بلا شرکت غیرے ہندوستان پہ حکومت کرتا رہا ۔

محمد شاہ کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا، اس کا ایک سکہ لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے جس پر یہ بیت منقوش ہے۔

سکہ زد بر زر بفضل اللہ
شاہ عالم پناہ احمد شاہ

۱۷۵۴ء میں عماد الملک نے مرہٹوں کی مدد سے عزیز الدولہ کو تخت پر بٹھایا، اس نے عالمگیر ثانی کا لقب اختیار کیا، اس کے عہد میں جو سکے مضروب ہوئے ان پر یہ شعر کندہ تھا۔

سکہ زد بر ہفت کشور ہمچو تابان مہر و ماہ
شاہ عزیز الدین عالمگیر غازی بادشاہ

اس کے چند روز بعد ایک نیا سکہ مضروب ہوا جس پر یہ بیت منقوش تھی۔

بہ زر زد سکہ صاحب قرانی
عزیز الدین عالمگیر ثانی

شاہجہان آباد کی ٹکسال سے ۱۱۷۳ھ میں عالمگیر ثانی نے ایک سکہ جاری کیا جس پر یہ بیت منقوش تھی۔

سکہ زر یافت رونق چو مہر منیر
از نام شاہ جہان بادشاہ عالمگیر

اس کے عہد میں جموں کے ہندو راجہ نے بھی ایک سکہ جاری کیا، اس پر یہ شعر منقوش تھا[۱۹]

---

[۱۹] ایضاً، ص ۳۹۵

خانہ رنجیت دیو آباد کرد
لچھمی نراین دل شاد کرد

عالمگیر ثانی کو اس کے وزیر غازی الدین نے کسی بات پر ناراض ہو کر ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء کو مروا ڈالا اور اس کی جگہ شہزادہ علی گوہر کو شاہ عالم ثانی کے لقب سے تخت ہندوستان پر بٹھایا۔ وہ خود بھی شاعر تھا اور اس نے اپنے سکہ پر جو بیت کندہ کروائی وہ اس کے ذوق شعری کی آئینہ دار ہے[۲۰]۔

سکہ زد بر ہفت کشور سایہ فضل اله
حامی دین محمد شاہ عالم بادشاہ

شاہ عالم ثانی کے بعد بیدار بخت تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے سکوں کے سے یہ شعر پسند کیا۔

سکہ زد بزر وارث تاج و تخت
شاہ جہان محمد بیدار بخت

اس کے بعد اکبر شاہ ثانی نے عنان حکومت سنبھالی۔ وہ برائے نام بادشاہ تھا تمام ملک انگریزوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ صرف لال قلعہ کے اندر ہی اس کا حکم چلتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے سکوں پہ یہ شعر منقوش کرا دیا۔

سکہ زد در جہان ز فضل اله
حامی دین محمد اکبر شاہ

---

[۲۰] سکہ در ذاتی مجموعۂ مسکوکات راقم الحروف

اکبر شاہ کا ایک اور سکہ بھی دستیاب ہوا ہے جس پر یہ بیت موجود ہے۔

بسیم و زر زدہ سکۂ جہانبانی
چراغ دودۂ تیمور اکبر ثانی

اکبر شاہ کے جاتے ہی ۱۲۵۳ھ میں عروسِ سخن کے گیسو سنوارتے ہوئے ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ ثانی تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے نام سے جو روپے جاری کئے ان پر یہ شعر منقوش تھا۔

بسیم و زر زدہ شد سکہ بفضل الہ
سراج الدین ابوظفر شہ بہادر شاہ

ان کے زمانۂ حکومت میں انقلاب رونما ہوا اور انگریزوں نے مغلیہ حکومت کی بساط الٹ دی۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے ساتھ ہی کابل اور اودھ میں دو نئی سلطنتیں قائم ہو گئیں جنہوں نے تا دیر اس سرزمین پر پرچم اسلام کو سربلند رکھا۔ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ نے ۱۲۶۴ھ میں جو روپے جاری کئے ان پر یہ بیت منقوش کروائی۔

سکہ زد بر سیم و زر از فضل تائید الہ
ظلِ حق واجد علی سلطان عالم بادشاہ

احمد شاہ ابدالی نے شاہ جہان آباد کی ٹکسال سے اپنے دورانِ قیام ہندوستان میں جو روپے جاری کئے ان پر یہ بیت منقوش تھی[۲۱]

---

[۲۱] ا۔ سکہ درانی مجموعۂ مسکوکات راقم الحروف
اا۔ گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، مطبوعہ مدراس ۱۹۵۹ء ص ۳۶۵

حکم شد از قادر بیچون با احمد پادشاہ
سکہ زن بر سیم و زر از اوج ماہی تا باہ[۱۱]

میرے ذاتی مجموعہ میں احمد شاہ ابدالی کے جو سکے موجود ہیں ان میں سے ایک پر یہی شعر اور سنہ جلوس میمنت مانوس ۱۴ درج ہے۔ یہ سکہ آنولہ کی ٹکسال سے جاری ہوا تھا، ابدالی ۱۱۶۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا، اس میں ۱۴ جمع کرنے سے تو ۱۱۷۴ھ بنتا ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں مرہٹوں کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر وہ دواب میں داخل ہوا تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی جنگ جیت کر خواجہ عبید اللہ کو لاہور کا گورنر مقرر کیا اور خود افغانستان لوٹ گیا۔ اس کے پنجاب سے جاتے ہی سکھوں نے لاہور پر یورش کر دی اور جسا سنگھ کی سرکردگی میں شہر فتح کر لیا۔ اس کی تفصیل ذرا میر غلام علی آزاد کی زبان سے سنئے ــ

"قوم سکھ بکسر سین مہملہ و تشدید کاف تازی ساکن صوبۂ پنجاب کہ از قدیم الایام خمیر مایۂ فتنہ و فساد اند و با اسلامیان عداوت و تعصب شدید دارند تا آنکہ معائنہ کردہ بودند کہ شاہ چندین مرتبہ ہندوستان را بی سپر ساخت از راہ ناعاقبت اندیشی علم بغی و شورش افراشتہ نائب شاہ را در لاہور کشتند و جسا سنگھ نامی را از قوم خود بپادشاہی برداشتہ دلیرانہ بر مسند جم نشاندند و روی سکہ را بنام او سیاہ کردند"[۲۲]۔

جسا سنگھ نے جو سکے مضروب کروائے ان پر یہ بیت منقوش تھی[۲۳]

---

[۲۲] میر غلام علی آزاد، خزانۂ عامرہ، مطبوعہ نولکشور پریس کانپور، ص ۱۱۴

[۲۳] کننگھم، ہسٹری آف دی سکھز، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۵ء ص ۸۹

[۱۱] خوشونت سنگھ، اے ہسٹری آف دی سکھ، جلد اول، مطبوعہ پرنسٹن ۱۹۶۶ء، ص ۵۲

سکہ زد در جہاں بفضلِ اکال
تخت احمد گرفت جسا کلال

جسا سنگھ کے ساتھیوں میں سے جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ بگڑ بیٹھے کہ اس نے اپنا نام سکے پہ کیوں منقوش کروایا ہے حالانکہ وہ دونوں بھی لاہور کی فتح میں اس کے برابر کے شریک تھے، اس لئے فیصلہ ہوا کہ آئندہ سکوں پہ صرف گورو مہاراج کا نام کندہ ہوا کرے گا۔

اس فیصلہ کے بعد جو سکے جاری ہوئے ان پہ یہ بیت کندہ تھی[۲۴]

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بیدرنگ،
یافت از نانک گورو گوبند سنگھ

احمد شاہ ابدالی کو خبر ملی کہ سکھوں نے اپنے سکوں پہ توہین آمیز کلمات منقوش کروائے ہیں تو اس نے برافروختہ ہو کر لاہور پہ حملہ کیا اور سکھ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

احمد شاہ ابدالی نے [illegible]ء میں انتقال کیا، اس کا بیٹا تیمور شاہ اس کا جانشین ہوا۔ اس کا ایک سکہ میرے پاس موجود ہے جس پہ یہ شعر منقوش ہے[۲۵]

چرخ می آرد طلاؤ نقرہ از خورشید و ماہ
تا کند بہ چہرہ نقش سکۂ تیمور شاہ

---

[۲۴] سکہ در ذاتی مجموعہ مسکوکات راقم الحروف
از کننگھم ہسٹری آف دی سکھز، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۵ء، ص ۹۴

[۲۵] سکہ در ذاتی مجموعہ مسکوکات راقم الحروف

اس کا ایک اور سکہ بھی دستیاب ہوا ہے جس پہ یہ بیت کندہ ہے۔[٢٦]

بعالم یافت سکہ تیمور شاہ نظام
بحکم خدا و رسول انام

تیمور شاہ نے بیس سال کی حکومت کے بعد ١٧٩٣ء میں عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا اور اس کا بیٹا شاہ زمان تخت نشین ہوا۔ اس کا ایک روپیہ میرے ذاتی مجموعہ میں موجود ہے جس پہ یہ بیت کندہ ہے۔[٢٧]

قرار یافت بحکم خدائے ہر دو جہان
رواج سکہ دولت بنام شاہ زمان

سات سال بعد ١٨٠٠ء میں اس نے وفات پائی اور اس کے نااہل جانشینوں نے بارک زئی امراء کے مقابلہ میں سلطنت کی بازی ہار دی۔ اس کے بعد ایسی باتیں خواب و خیال بن کر رہ گئیں اور پھر کسی بھی حاکم کو اپنے سکوں پہ شعر مضروب کروانے کی توفیق نہ ہوئی۔

* * *

---

[٢٦] گنڈا سنگھ۔ احمد شاہ درانی مطبوعہ مدراس ١٩٥٩ء ص ٣٦٦

[٢٧] ہری رام گپتا ہسٹری آف دی سکھز، جلد سوم، مطبوعہ لاہور ١٩٤٤ء۔ ص ٣٤۔
از سکہ در ذاتی مجموعہ مسکوکات راقم الحروف۔

اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی میں علماء و مشائخ کا کردار

شاہ جہاں کی تخت نشینی کے لئے اس کے بیٹوں میں جنگ ناگزیر تھی اس لئے وہ حصولِ تخت کے لئے علماء اور عوام کی حمایت حاصل کرنے میں میں کوشاں تھے۔ تخت نشینی کے لئے جنگ اورنگ زیبؒ اور دارا شکوہ کے درمیان نہ تھی بلکہ اصل معرکہ راسخ العقیدہ اور آزاد خیال مسلمانوں، شریعت اور آزاد تصوف، وحدت الشہود اور وحدت الوجود، پابند شریعت نقشبندیوں اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ہردے رام کے نظریات کے درمیان تھا۔ اگر اورنگ زیبؒ اول الذکر گروہوں کا نمائندہ تھا تو دارا شکوہ موخر الذکر گروہوں کا علمبردار تھا۔ ساموگڑھ کی جنگ حصولِ تخت کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کے آئندہ شاہنشاہ کی مذہبی حکمتِ عملی کا فیصلہ کرنے کے لئے لڑی گئی تھی۔

اورنگ زیب کے سوانح نگار ظہیر الدین فاروقی کے خیال میں ہندو اکبر جیسا بادشاہ تخت پر دیکھنا چاہتے تھے اور مسلمان اس کوشش میں تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ایسے حالات سے دوچار ہونے سے بچ جائیں۔[1]

---

[1] فاروقی، ظہیر الدین، اورنگ زیبؒ اینڈ ہز ٹائمز، مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۵ء، ص ۲۸

اس لئے فطری طور پہ ہندوؤں نے دارا شکوہ کی حمایت کی اور راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اورنگ زیبؒ کا ساتھ دیا، کیونکہ وہ راسخ العقیدہ اور پابند شریعت مسلمان تھا۔[1] مشہور مستشرق لین پول رقمطراز ہے کہ اسلام کی خدمت کے لئے اورنگ زیبؒ بڑا متشدد اور سخت گیر نظر آتا ہے۔ اس نے بڑی سختی اور جرأت کے ساتھ اگر ایک طرف اکبر اور دارا شکوہ کے وحدت الوجودی نظریات کے خلاف ردِ عمل شروع کیا تو دوسری طرف جہانگیر کی ''ناؤ نوش'' اور شاہجہان کی ''عیش کوشی'' پالیسی کے خلاف جنگ لڑی۔[2]

جب دارا شکوہ کے کفر و الحاد کی خبریں عوام کے کانوں تک پہنچیں تو قدرتی طور پہ اس کا فائدہ اورنگ زیبؒ کو پہنچا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ میں ایسے آثار نظر آتے تھے کہ وہ بڑھ کر دوسرا اکبر ثابت ہوگا۔ اسے ولی عہد سلطنت سمجھا جاتا تھا اور امور سلطنت میں اسے اتنا دخل تھا کہ راسخ العقیدہ گروہ کی کوششیں اکثر اس کی وجہ سے کالعدم ہوجاتی تھیں۔ اس لئے وہ لوگ جو راسخ الاعتقادی کے مخالف تھے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرسکتے تھے اور یہ امید بھی کرسکتے تھے کہ آئندہ کسی زمانے میں حکومت پہ ان کا اقتدار قائم ہوجائے گا۔ راسخ الاعتقاد طبقے کی امیدیں اورنگ زیبؒ پر مرکوز تھیں جو اپنے عقائد و اعمال میں نہ صرف راسخ الاعتقاد تھا بلکہ زاہد و متقی بھی تھا۔ اس کی پارسائی اور اس کے کردار میں وہ تمام خوبیاں

---

[1] لین پول، اسٹانلے، اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا ان دی مغل ایجز، مطبوعہ ممبئی سنہ ۱۹۱ء ص ۱۱۱

[2] ایضاً۔

موجود تھیں جو راسخ الاعتقادی کے خیرخواہوں کو اس کے گرد جمع کرنے کے لئے ضروری ہو سکتی تھیں۔[۴۷] شاہجہان کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان نے بھی اورنگ زیبؒ کی حمایت پر کمر باندھی اور متعدد بار اس نے بھرے دربار میں اورنگ زیبؒ کی حمایت کی اور اس وجہ سے اس نے داراشکوہ کی ناراضگی مول لی۔ جب نواب موصوف نے اچانک وفات پائی تو بعض لوگوں نے داراشکوہ پر زہر خورانی کا الزام بھی لگایا۔ شاہجہان کے راسخ العقیدہ درباری امراء نے بھی داراشکوہ کے مقابلہ میں اورنگ زیبؒ کی حمایت کی[۴۸]۔

اورنگ زیبؒ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کا بڑا معتقد تھا۔[۴۹] ان کے علاوہ وہ ان کے بھائیوں اور بیٹوں کا بھی بڑا لحاظ کرتا تھا۔ اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کے فوراً بعد خواجہ محمد معصومؒ اور ان کے برادر بزرگ حضرت محمد سعیدؒ شاہی دربار میں باریاب ہوئے، اورنگ زیبؒ نے اس موقع پر تین سو طلائی مہریں پیش کیں[۵۰] اس کے بعد بھی اورنگ زیبؒ نے متعدد موقعوں پر خواجہ صاحبؒ کو اپنے دربار میں بلایا اور ہر بار ان سے بڑی عقیدت کے ساتھ پیش آیا۔[۵۱] ان کے صاحبزادوں کی بھی

---

[۴۷] قریشی، اشتیاق حسین۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۵

[۴۸] فاروقی، اورنگ زیبؒ اینڈ ہز ٹائمز، ص ۶

[۴۹] یوسف حسین، گلمپسز آف مڈیول انڈین کلچر، مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۷ء، ص ۵۹

اا مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، مطبوعہ کانپور ۱۹۰۲ء، ص ۶۴۰

[۵۰] ابوالفتح، آداب عالمگیری، قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن، ایتھے ۳۱۷، ورق ۴۳۱ ب

اا محمد کاظم، عالمگیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء، ص ۲۹۳

[۵۱] محمد بقا، مرآۃ العالم، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، ایتھے ۱۲۴، ورق ۵۴۵ ب

شاہی دربار میں بڑی عزت کی جاتی تھی۔[۹] مرأت العالم کے مصنف کے بیان کے مطابق اورنگ زیبؒ نے اپنے چوتھے سال جلوس میں حضرت محمد سعیدؒ کو شاہی دربار میں بلایا اور ان کی بڑی تکریم کی۔[۱۰] ان کی باریابی کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ عبدالاحدؒ اور شیخ محمد فرخ اورنگ زیبؒ سے ملے اور رخصت کے وقت بادشاہ نے ان کی خدمت میں بڑے تحائف پیش کئے۔[۱۱] حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے شیخ محمد یحییٰؒ سے بھی اورنگ زیبؒ کی اکثر ملاقات رہتی تھی اور ہمیشہ انہیں نقد اور تحائف دیا کرتا تھا۔[۱۲]

اورنگ زیبؒ دہلی سے لاہور جاتے اور واپس آتے وقت سرہند میں خواجہ محمد معصومؒ اور خاندانِ مجددؒ کے دیگر افراد سے ملا کرتا تھا۔ عہدِ عالمگیر کے ایک ہندو مؤرخ ایشرداس نے اورنگ زیبؒ کے اٹھارویں سال جلوس کے واقعات میں خانقاہِ مجددیہ کے قریب لولکھا باغ میں بادشاہ کے قیام کا ذکر کیا ہے۔[۱۳] اورنگ زیبؒ نے خواجہ محمد معصومؒ سے متعدد بار استدعا کی کہ وہ سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہا کریں۔ لیکن انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کی نصیحت کے مطابق بادشاہ کے ساتھ رہنا پسند نہیں فرمایا۔[۱۴] آپ نے اپنی جگہ اپنے فرزندِ پنجم حضرت سیف الدینؒ کو دہلی بھیج دیا جہاں وہ بقول محمد ساقی مستعد خان قلعہ کے اندر شاہی محل کے

---

[۹] ایضاً۔ [۱۰] ایضاً۔ [۱۱] ایضاً۔ [۱۲] ایضاً۔ [۱۳] ایشرداس۔ فتوحات عالمگیری، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن۔ ایڈیشنل ۲۳۸۸۴، ورق ۷۲ الف۔

[۱۴] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۰

[۱۵] محمد مراد، مناقب الحضرات، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، ایتھے ۶۴۲، ورق ۱۰۶ الف۔

جوار میں رہنے لگے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بادشاہ کاروبار سلطنت سے فارغ ہو کر رات گئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا۔[15] مآثر عالمگیری میں ایسی ہی ایک صحبت کی تفصیل درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیبؒ حضرت سیف الدینؒ سے توجہ لینے کے علاوہ ان کی نگرانی میں منازل سلوک بھی طے کیا کرتا تھا۔[16] تھوڑے ہی عرصہ میں بادشاہ نے سلوک کی کئی منازل طے کر لیں۔ حضرت سیف الدینؒ نے اپنے والد مکرم کے نام ایک خط میں بڑی مسرت کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

> بادشاہ دین پناہ را در خدمت حضرت اخلاص بنوع دیگر است از ذکر لطائف و ذکر سلطانی گذشتہ بہ ذکر نفی و اثبات مقید است و ظاہر می سازد کہ بعضے اوقات خطرہ مطلقاً نمی آید و گاہے کہ می آید استقرار نمی کرد۔ ازین راہ خیلے محفوظ است و می گوید کہ پیش ازین من از ہجوم خواطر دل تنگ بودم، و شکر این نعمت بجا می آرد۔[17]

حضرت سیف الدینؒ کے خط کے جواب میں خواجہ محمد معصومؒ نے جو خط تحریر فرمایا تھا وہ ان کے مکتوبات میں موجود ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے اپنے مکتوب میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے۔ جس نے بادشاہ کو روحانی

---

[15] محمد ساقی مستعد خان، مآثر عالمگیری، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۰ء، ص ۸۴،

[16] ایضاً۔

[17] مکتوبات سیفیہ، مطبوعہ سعید آرٹ پریس حیدر آباد، مکتوب نمبر ۲، ص ۱۱۔

مراتب عطا فرمائے ہیں۔ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو ۔۔ فنا قلبی ۔۔ کا مقام حاصل ہو چکا تھا، جو ولائت میں ایک اعلیٰ مقام سمجھا جاتا ہے۔[۱۱۸]

اورنگ زیبؒ نے اپنے بارہویں سال جلوس میں اپنے بیٹے محمد اعظم کی شادی کی تو اس تقریب میں جو علماء مشائخ موجود تھے ان میں حضرت سیف الدینؒ کا نام نامی بھی شامل ہے[۱۱۹] اورنگ زیبؒ کے دل میں حضرت سیف الدینؒ کے برادر بزرگ اور خواجہ محمد معصومؒ کے جانشین خواجہ محمد نقشبندؒ کی بڑی عزت تھی سنہ ۱۰۹۰ھ میں آپ بادشاہ کے ساتھ موجود تھے۔[۱۲۰] خواجہ محمد نقشبندؒ کے مکتوبات وسیلۃ القبول الی اللہ والرسول کے نام سے پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی سعی و کاوش سے دو جلدوں میں سنہ ۱۹۶۳ء میں حیدرآباد سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں خواجہ موصوف کے کئی خطوط بادشاہ کے نام موجود ہیں۔ جن سے ان کے باہمی تعلقات پہ کافی روشنی پڑتی ہے۔ سنہ ۱۰۹۹ھ میں اورنگ زیبؒ کے حکم سے خواجہ موصوف کے صاحبزادے محمد عمرؒ کی شادی ابوالحسن تانا شاہ کی بیٹی سے ہوئی۔[۱۲۱] اگر روضۃ القیومیہ کی روایت پہ اعتماد کیا جائے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ خواجہ محمد معصومؒ کے صاحبزادے حضرت محمد اشرف اور بھتیجے

---

[۱۱۸] مکتوبات خواجہ محمد معصوم، اردو ترجمہ مطبوعہ لکھنؤ سنہ ۱۹۶۰ء، مکتوب ۲۲، ص ۲۸۱-۲۸۰

[۱۱۹] محمد ساقی مستعد خان، مآثر عالمگیری، ۸۷۔

[۱۲۰] ایضاً، ص ۲۷۶

[۱۲۱] ایضاً، ص ۳۱۲

شیخ سعد الدینؒ اورنگ زیبؒ کے زمانۂ شہزادگی میں اس کے ساتھ دکن میں مقیم تھے[۲۲] اور جب اورنگ زیبؒ دارا شکوہ کے مقابلہ پہ نکلا تو شیخ محمد اشرفؒ اس کی فوج میں موجود تھے[۲۳]۔

حضرت سیف الدینؒ نے بادشاہ کے ساتھ رہ کر ترویج شریعت اور احیائے سنت کے لئے بڑا کام کیا۔ موصوف کے خطوط کا مجموعہ مکتوبات سیفیہ کے نام سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی محنت اور کوشش سے حیدر آباد سے طبع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں بادشاہ کے نام حضرت سیف الدینؒ کے دو درجن کے قریب مکتوبات موجود ہیں جن میں بادشاہ کی توجہ رفع بدعت اور احیائے سنت کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ موصوف کی انہی خدمات کی بنا پر نقشبندی حلقوں میں آپ کو محی السنت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے[۲۴]۔ میری ناقص رائے میں یہ خاندانِ مجددؒ ہی تھا جس نے اورنگ زیبؒ کو محی الدین بنا دیا۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد ان کے تیسرے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ ان کے جانشین ہوئے۔ آپ اپنی علمیت، تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے عوام میں بے حد مقبول تھے۔ اپنے والد کی طرح آپ بھی عمر بھر ترویج شریعت اور احیائے سنت کے لئے

---

[۲۲] کمال الدین محمد احسان، روضۃ القیومیہ، رکن دوم، مطبوعہ لاہور ۱۳۲۵ھ، ص ۱۰۷

[۲۳] ایضاً [۲۴] i. وکیل احمد، ہدیۂ مجددیہ، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۹ھ، ص ۳۳۲

ii. مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۶

iii. سید امام الدین، برکاتِ اولیاءؒ، مطبوعہ دہلی ۱۳۲۲ھ، ص ۱۳۲

کوشاں رہے۔ آپ کی اپنے مریدوں کو ہمیشہ یہی نصیحت ہوا کرتی تھی کہ وہ حتی الوسع سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلیں[۲۵]۔ اپنے ایک مکتوب میں آپ اپنے ایک مخلص مرید مولانا محمد حنیفؒ کے نام تحریر فرماتے ہیں کہ ایک صوفی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے بغیر اپنے مقصود تک پہنچے[۲۶]۔ اسی طرح آپ اپنے ایک دوسرے مرید محمد صدیقؒ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مردہ سنت کو زندہ کرتا ہے اُسے قیامت کے دن سو شہیدوں کا ثواب دیا جائے گا[۲۷]۔ حضرت مجدد صاحبؒ کی طرح خواجہ محمد معصومؒ نے بھی اپنے مکتوبات میں ترویج شریعت اور احیائے سنت پر بہت زور دیا ہے۔

جب داراشکوہ نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے اپنی دلچسپی ظاہر کی اور ان کے ترجمہ اور نشر و اشاعت میں سرگرمی دکھانے کے علاوہ اس نے ہندوؤں کے کئی عقائد بھی اپنا لئے تو مذہبی طبقوں میں اس کے خلاف ردِعمل پیدا ہوا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تحریر فرماتے ہیں کہ داراشکوہ کے تخت نشین ہونے کی صورت میں راسخ الاعتقاد گروہ کے لئے بہت خطرات درپیش تھے، کیونکہ اکبر کے آخری زمانے کے بعد سے اس گروہ کو جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ سب ملیامیٹ ہو جاتی۔ داراشکوہ ہندومت اور اسلام کے بالکل ایک ہونے پر پکا عقیدہ رکھتا تھا اور اس نے

---

[۲۵] مکتوبات معصومیہ (فارسی) مطبوعہ کانپور ۱۲۸۸ھ، مکتوب نمبر ۲۲، ۶۰، ۸۹، ۱۰۰، ۱۷۰، ۲۲۰۔

[۲۶] ایضاً، مکتوب نمبر ۲۲ [۲۷] ایضاً۔ مکتوب نمبر ۲۲۸

اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ اگر داراشکوہ بادشاہ ہوجاتا تو اس میں اور اکبر میں خاص فرق یہ ہوتا کہ اکبر کا دماغ تو رسمی تعلیم کے ذریعے تربیت یافتہ نہیں تھا اور داراشکوہ ایک لائق و فائق فاضل تھا اس طرح وہ راسخ الاعتقادی کے مفادات کو اور زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ہمارے خیال میں اس موقع پر راسخ الاعتقاد مسلمان داراشکوہ کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھنے لگے۔ انہی ایّام میں خواجہ محمد معصومؒ اپنے ایک مرید حسن علیؒ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "برادرِ عزیز! آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان دنوں بدعات عام ہوتی جا رہی ہیں اور سنت پس پشت ڈالی جا رہی ہے۔ اس تاریک زمانے میں فوری اور اہم ترین کام، علومِ شریعت کی تحصیل اور ان کی نشر و اشاعت ہے۔ اسی طرح ترویجِ شریعت اور احیائے سنتِ نبویؐ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کو چاہیئے کہ آپ علومِ شریعت کی نشر و اشاعت اور احیائے سنت کے لئے بڑھ چڑھ کر کوشش کریں"[29] اسی طرح اپنے ایک مکتوب میں آپ مولانا جمال الدین کو نصیحت فرماتے ہیں کہ وہ پوری تندہی سے ترویجِ شریعت اور احیائے سنت کے لئے کام کریں[30]۔

اِن امثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ محمد معصومؒ ترویجِ شریعت اور احیائے سنت کے لئے کس قدر کوشاں رہتے تھے۔

---

[28] برِ عظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۵

[29] مکتوباتِ خواجہ محمد معصومؒ (فارسی) مطبوعہ کانپور ۱۸۸۷ء، مکتوب نمبر ۱۷۸

[30] ایضاً، مکتوب نمبر ۱۷۰۔

مفتی غلام سرور لاہوری کے قول کے مطابق آپ کے سات ہزار کے قریب خلفا اور نو لاکھ کے قریب مرید سلطنتِ مغلیہ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے جو اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اپنے پیر و مرشد کے مشن کی تکمیل میں دل و جان سے لگے رہتے تھے[31]۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کی روایت کے مطابق عالمگیری فوج میں بھی آپ کے خلفا موجود تھے[32]۔ مناقب الحضرات کی روایت کے مطابق سینکڑوں کی تعداد میں خوانین اور امراء آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے جو گاہ گاہے آپ سے ملتے رہتے تھے[33]۔ علاوہ ازیں علما اور طلبا کا ایک جمِ غفیر ہمہ اوقات آپ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا[34]۔

معتبر روایت کے مطابق خواجہ محمد معصوم کے نو لاکھ کے قریب مرید تھے جن میں سے سات ہزار کو خرقۂ خلافت عطا ہوا تھا[35]۔ شیخ محمد بقا رقمطراز ہیں کہ عہدِ جہانگیری میں ملک کے طول و عرض میں آپ کے بے شمار مرید پھیلے ہوئے تھے[36]۔ مغلیہ حکومت کے دائرہ اختیار سے باہر بھی آپ کے مریدوں کی کافی بڑی تعداد آباد تھی۔ جب آپ حج بیت اللہ کے لیے

---

[31] خزینۃ الاصفیاء۔ جلد اوّل، ص ۶۴۰

[32] تاریخ کشمیر اعظمی، مطبوعہ سری نگر ۱۸۴۶ء، ص ۱۶۲

[33] محمد مراد، مناقب الحضرات (دانگہ بنام عندی) ورق ۱۷۸ الف

[34] ایضاً۔

[35] رحمٰن علی، تذکرۂ علمائے ہند، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۴ء، ص ۲۱۲

[36] شیخ محمد بقا، مرأت العالم، ورق ۵۵ ب۔

حجاز تشریف لے گئے تو وہاں بے شمار لوگوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی[۲۳۸]۔ علاوہ ازیں آپ نے محمد صدیق بخاریؒ کو خرقۂ خلافت دے کر حرمین شریفین میں سلسلۂ عالیہ کی ترویج کے لیے بھیجا تھا[۲۳۹]۔

خواجہ محمد معصومؒ اور شیخ آدم بنوریؒ کے مریدوں کی اس قدر تعداد باعث تعجب نہیں، صرف اتنی سی بات ذہن میں رکھنی کافی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات عام ہو رہی تھیں اور ان کا سلسلہ اندرون اور بیرونِ ملک آکاس بیل کی طرح پھیل رہا تھا۔ جن ایام میں ہندوستان کا شاہنشاہ اپنے دار الحکومت میں تخت طاؤس پہ بیٹھ کر وسطِ ایشیاء پر اپنا تسلط قائم رکھنے میں ناکام رہا، سرہند اور بنوڑ کے بوریہ نشین فقیر وسط ایشیاء کے باشندوں کے دلوں پہ حکومت کر رہے تھے۔ اس کا اندازہ خواجہ محمد معصومؒ سرہندی اور شیخ آدم بنوریؒ کے خلفاء کی فہرستیں دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے جن میں اکثر و بیشتر نام ماوراء النہر والوں کے ہیں۔

اورنگ زیبؒ اپنے عنفوانِ شباب ہی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے متاثر ہو چکا تھا اور اس نے ان کے جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ زمانہ شہزادگی میں اس کی خط و کتابت اکثر خواجہ صاحبؒ سے رہتی تھی۔ خواجہ صاحبؒ کے مکتوبات میں ایسے مکاتیب موجود ہیں جو ”شاہزادہ دین پناہ“ کے نام لکھے گئے تھے[۲۴۰]۔ جب خواجہ صاحب حج بیت اللہ کے ارادہ سے سورت

---

[۲۳۸] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۰

[۲۳۹] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (اردو) مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۰ء، مکتوب نمبر ۹۴، ص ۲۲۶۔

[۲۴۰] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی) مکتوب ۴ و ۶ ص ۱۱۳

روانہ ہوئے تو اورنگ زیبؒ ان دنوں دکن میں مقیم تھا۔ اس نے اس موقعہ پر آپ کی ملاقات کو غنیمت جانا اور نربدا عبور کرکے آپ سے ملنے آیا اور آپ کی دعائیں حاصل کیں[۱۴۰]۔ مفتی غلام سرور لاہوری کی روایت کے مطابق آپ نے مدینہ منورہ میں روضۂ رسولؐ پر اورنگ زیب کی کامیابی کے لئے دُعا کی تھی[۱۴۱]۔

”شہزادہ دین پناہ“ کے نام ایک مکتوب میں خواجہ صاحبؒ اُسے جہاد شروع کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں ایک گھڑی کا جہاد حرم مکہ میں حجر اسود کے پاس لیلۃ القدر کے قیام سے افضل ہے[۱۴۲]۔

جب اورنگ زیبؒ برہانپور سے فوج لیکر نکلا تو خواجہ صاحب نے اُسے ایک خط ارسال کیا جس میں اُسے دارالحکومت پر فوج کشی پر تحسین پیش کی۔ اسی مکتوب میں آپ اُسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یاد دلاتے ہیں جس میں اُنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہدوں کو اجرِ عظیم کی بشارت دی ہے[۱۴۳]۔ اس مکتوب سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ محمد معصومؒ دارا شکوہ کے خلاف اورنگ زیبؒ کی یلغار کو محض تخت نشینی کے لئے شاہزادوں کی جنگ نہیں بلکہ جہاد سمجھتے تھے۔

---

[۱۴۰] کمال الدین محمد احسان، روضۃ القیومیہ، رکن دوم، ص ۱۰۷

[۱۴۱] خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۰

[۱۴۲] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی)، مکتوب نمبر ۹۳، ص ۱۱۲

[۱۴۳]

سطورِ بالا سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ دارا شکوہ کے خلاف فوج کشی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خاندان اور ان کے عقیدتمندوں کی ہمدردیاں اورنگ زیبؒ کے ساتھ تھیں۔

دارا شکوہ جسے اورنگ زیبؒ رئیس الملاحدہ، ملحد نامقبول اور ملحد نکو سیدہ نعال کہا کرتا تھا[۴۴]، کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے اورنگ زیبؒ نے ایک ماہ برہانپور میں فوجی تیاریوں میں بسر کیا۔[۴۵] یہ شہر ان دنوں مغلیہ سلطنت کے آباد ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا اور عوام اُسے دار السرور کہا کرتے تھے۔[۴۶] یہ شہر نقشبندیوں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے خلیفۂ اوّل میر محمد نعمانؒ کو نقشبندیہ سلسلہ کی ترویج کے لئے برہانپور بھیجا تھا۔[۴۷] میر صاحبؒ ترکِ سکونت کر کے اکبر آباد چلے گئے تو ان کی جگہ حضرت مجددؒ نے خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کو برہانپور بھیجا۔[۴۸] خواجہ موصوف کے "شہزادہائے عالی مرتبہ" کے ساتھ بڑے خوشگوار تعلقات تھے اور ان کی فرمائش پر آپ نے متعدد غزلیں کہی تھیں جو ان کے دیوان میں موجود ہیں۔[۴۹] مجدد الف ثانیؒ کے بعد یہ شہر خواجہ محمد معصومؒ

---

[۴۴] عنایت خان، عنایت نامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۴۱۰۔ ورق ۲۶ الف تا ۲۷ الف

[۴۵] محمد کاظم، عالمگیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ص ۴۸۔

[۴۶] بھیم سین، نسخۂ دلکشا، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۲۳، ورق ۶ الف تا ب۔

[۴۷] محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۹۔

[۴۸] ماہنامہ المعارف لاہور بابت ماہ مئی ۱۹۶۸ء ملاحظہ ہو راقم السطور کا مضمون بعنوان: خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ۔

[۴۹] این چہار غزل را کہ در اول بیت ہمان حرف آخر است در ردیف مشکل باشارہ شاہزادہائے عالی مرتبہ مد ظلہم نظم نمودہ اند۔ دیوان خواجہ محمد ہاشم کشمی، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، مائیکرو فیلم عندی۔

کی توجہ کا بھی مرکز رہا اور آپ نے اپنے متعدد خلفاؒ کو عوام کی رشد و ہدایت کے لیے برہانپور روانہ کیا۔ ان خلفاء میں سے ابو المنظفر صوفیؒ نے بڑا نام پایا۔ سید امام دین کے قول کے مطابق صوفی صاحبؒ برہانپور کے عوام میں بہت مقبول ہوئے اور بے شمار لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔[۵۰] نقشبندیوں کے علاوہ دیگر سلاسل کے جو بزرگ برہانپور میں رہائش پذیر تھے انھوں نے بھی اورنگ زیبؒ کی حمایت کا اعلان کیا۔[۵۱]

اورنگ زیبؒ کی تعلیم و تربیت اس دور کے بڑے جیّد اور دیندار علماؒ کی نگرانی میں ہوئی تھی اور وہ سب کے سب اپنے علم و تقویٰ کی بنا پر عوام میں بے حد مقبول تھے اور فطری طور پر انھوں نے دارا شکوہ جیسے "رئیس الملاحدہ، ملحد نامقبول اور ملحد نکوسیدہ فعال" کے خلاف اورنگ زیبؒ کا ساتھ دیا تھا۔ منوچی لکھتا ہے کہ اورنگ زیبؒ کا ایک استاد شیخ میرک خوافی ۱۶۵۹ء میں اجمیر کے قریب دارا شکوہ کے خلاف لڑتا ہوا میدانِ کارزار میں کام آیا۔[۵۲]

شیخ آدم بنوریؒ نے اپنی وفات سے کافی عرصہ پہلے اپنے مریدوں کو اورنگ زیبؒ کی حمایت کرنے کی نصیحت فرمائی تھی۔[۵۳] شاہ نعمت اللہ ولیؒ کے اخلاف میں سے خلیل اللہ خان نے اپنے ساتھیوں سمیت جنگ تخت نشینی

---

[۵۰] امام الدین، برکاتِ اولیا، مطبوعہ دہلی ۱۳۲۲ھ، ص ۱۳۸

[۵۱] یوسف حسین، گلمپسز آف دی مڈیول انڈین کلچر، ص ۶۰ - ۵۹۔

[۵۲] منوچی، سٹوریا ڈو موگر، مطبوعہ لندن ۱۹۰۷ء، ص ۲۳۰

[۵۳] محمد مراد، مناقب الحضرات، ورق ۲۰۲ الف

میں اورنگ زیبؒ کی حمایت کی[54]۔ قصور کے افغانوں نے شیخ آدم بنوریؒ کے خلیفہ شیخ عبدالخالقؒ کی خدمت میں استدعا کی کہ وہ اورنگ زیبؒ کی کامیابی کے لئے دعا فرمائیں[55]۔ ان امثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس جنگ میں نقشبندیوں کا عام رجحان اورنگ زیبؒ کی طرف تھا۔

شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے اخلاف میں سے شیخ الاسلام خواجہ عابد، جن کا شمار ماوراءالنہر کے جید علما میں ہوتا ہے، اورنگ زیبؒ کی حمایت میں داراشکوہ کے خلاف لڑے۔ داراشکوہ کی شکست کے فوراً بعد اورنگ زیبؒ نے انہیں سہ ہزاری ذات اور پانصد سوار کا منصب اور "خان" کا خطاب عطا کیا[56]۔ جب دوبارہ داراشکوہ اور راجہ جسونت سنگھ اورنگ زیبؒ کے مقابلہ کو نکلے تو اس جنگ میں بھی خواجہ عابد نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ اورنگ زیبؒ نے اس بار انہیں ترقی دے کر چہار ہزاری ذات اور ہفت صد سوار کا منصب عطا کیا۔ چوتھے سال جلوس میں اورنگ زیبؒ نے انہیں صدر کے عہدہ پر فائز کیا۔ اس کے دو سال بعد آپ اجمیر کے گورنر بنے اور چند سال بعد آپ کا ملتان تبادلہ ہوگیا[57]۔ چوبیسویں سال جلوس میں اورنگ زیبؒ نے رضوی خان کی جگہ خواجہ عابد کو "صدر کل ہندوستان" بنایا[58]۔

---

[54] محمد شفیع، مرأت الواردات، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، ایڈیشنل ۶۵۷۹، ورق ۸۶ ب

[55] محمد مراد، مناقب الحضرات، ورق ۷۳ الف

[56] شاہنواز خاں، مآثر الامراء، مطبوعہ کلکتہ [illegible]ء، جلد سوم ص ۱۲۰

[57] ایضاً، ص ۱۲۱

[58] ایضاً، ص ۱۲۲

شہرۂ آفاق محدث شیخ طاہر پٹنیؒ کے پوتے شیخ عبدالوہاب سے زمانۂ شہزادگی میں اورنگ زیبؒ کی راہ و رسم تھی[59]۔ جب اورنگ زیبؒ برہان پور سے دارا شکوہ کے مقابلہ کے لئے نکلا تو شیخ عبدالوہاب نے فتویٰ جاری کیا کہ شاہجہان بیماری اور ضعف کی بنا پہ کاروبار سلطنت چلانے سے معذور ہے۔ اس لئے اورنگ زیبؒ کی دارالحکومت پہ فوج کشی شرعاً جائز ہے[60]۔ اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کے فوراً بعد اس صلہ میں آپ کو قاضیٔ عسکر کے عہدے پہ فائز کیا گیا[61]۔

اسی طرح برہان پور کے ملا قطب ہانسی کے ساتھ بھی اورنگ زیبؒ کے بڑے عمدہ مراسم تھے۔ انھوں نے بھی اس مہم میں اورنگ زیبؒ کی دل و جان سے مدد کی جس کے صلہ میں اورنگ زیبؒ نے تخت نشین ہوتے ہی انہیں ایک گاؤں بطور جاگیر اور چار لاکھ دام نقد عطا کئے[62]۔

مسلمانوں کے دیندار اور دینی حمیت رکھنے والے طبقہ نے دل و جان کے ساتھ اس جنگ میں اورنگ زیبؒ کا ساتھ دیا کیونکہ وہ حصول تخت کے لئے ان کا نمائندہ تھا۔ مشہور ہندو مؤرخ لکھی لال رائے چوہدری رقمطراز ہے کہ اورنگ زیبؒ نے "مذہب خطرہ میں ہے" کا نعرہ[63] [illegible] جو بڑا سودمند

---

[59] ایضاً، جلد اول، ص ۲۲۵

[60] ڈاکٹر پی سرن، دی پراونشل گورنمنٹ آف دی مغلز، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۴۱ء، ص ۳۴۵

[61] مآثر الامرأ، جلد اول، ص ۲۲۶۔

[62] محمد بقا، مرأت جہاں نما، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۹۹۸، ورق ۲۴۴ الف۔

ثابت ہوا اور اس طرح اس نے اپنا سیاسی مقصد حاصل کیا۔[٦٣] فاروقی صاحب کے خیال میں اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی پر دیندار طبقوں میں بڑی مسرّت کا اظہار کیا گیا اور لوگ اسے نجات دہندہ سمجھنے لگے کیونکہ انھیں یہ اندیشہ دامنگیر تھا کہ دارا شکوہ کی کامیابی سے اکبر کا زمانہ واپس لوٹ آئے گا۔[٦٤]

تخت نشینی کے بعد بھی اورنگ زیبؒ نے خواجہ محمد معصومؒ کے ساتھ اپنے تعلقات قائم رکھے،[٦٥] اور بسا اوقات وہ مذہبی امور میں ان سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ خواجہ صاحبؒ کے بعض مکتوبات سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ مذہبی امور میں ان کی ہدایات کا منتظر رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحبؒ بھی اورنگ زیبؒ کی پالیسی سے متفق تھے اور اس کے لئے اکثر دُعا کیا کرتے تھے۔[٦٦] اورنگ زیبؒ نے اپنے دورِ حکومت میں اکبر اور دارا شکوہ کی جاری کردہ بدعات کو ختم کرنے کی دِل و جان سے کوشش کی اور اس طرح اس نے حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

---

[٦٣] مکھن لال رائے چوہدری، دی سٹیٹ اینڈ ریلیجن ان مغل انڈیا، مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۹۵۱ء، ص ۲۱۹۔

[٦٤] فاروقی، ظہیر الدین، اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۳۵ء، ص ۵۶۴۔

[٦٥] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (اردو)، مکاتیب نمبر ۶، ۶۴، ۲۲۱، ۲۲۷۔

[٦٦] ایضاً، مکتوب نمبر ۲۲۷ ص ۲۸۶ - ۲۸۵۔

مسجدِ قبا سے تاج محل تک

دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف اقسام کا طرزِ تعمیر رائج ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر ممالک کی مذہبی اور تاریخی روایات، آب و ہوا اور جغرافیائی محلِ وقوع ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان چیزوں کا طرزِ تعمیر پہ گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پہ یورپی ممالک میں، جہاں برفباری کثرت سے ہوتی ہے۔ مکانات کی چھتیں ڈھلوان بنائی جاتی ہیں تاکہ برف گرتے ہی چھت پر سے نیچے پھسل جائے۔ اگر وہاں چھتیں ہمارے ہاں کی چھتوں کی طرح ہموار ہوں تو وہ برف کے بوجھ سے نیچے گر پڑیں۔ مذہبی روایات بھی کافی حد تک طرزِ تعمیر میں دخیل ہیں، ہم ایک مسجد کو مندر یا کلیسا کی طرز پہ تعمیر نہیں کر سکتے، علاوہ ازیں مسجد کا قبلہ رُخ ہونا بھی شرط ہے۔ اسی طرح یہ چیز بھی مدِنظر رکھی جاتی ہے کہ وہاں سامانِ تعمیر کس قسم کا میسر آ سکتا ہے۔ مثلاً کشمیر میں عمارتی لکڑی کی افراط ہے اس لئے وہاں کی عمارتوں میں اس کا آزادانہ استعمال ہوتا ہے۔ سرینگر کے شاہی محلات اور شاہ ہمدان کی مسجد میں اخروٹ کی لکڑی پر کھدائی کے نادر نمونے پائے جاتے ہیں۔ ٹنڈرا کے علاقے میں سوائے برف کے اور کچھ دستیاب نہیں ہو سکتا ہے

اس لیے وہاں اینٹ پتھر کی عمارات بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ مختلف حالات کے تحت مختلف ممالک میں مخصوص طرز کی عمارات بنانے کا رواج ہے۔

اس وقت دنیا میں چینی، مصری، سومیری، یونانی، رومن، بازنطینی، گاتھک، ہندی، اسلامی اور مغل طرزِ تعمیر مشہور ہیں۔ چینی طرزِ تعمیر تا حال چین، جاپان، اور قریبی ممالک میں رائج ہے۔ گاتھک طرزِ تعمیر یورپ میں رائج تھا، مگر اب روز بروز ختم ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں کے گرجے اسی طرزِ تعمیر کے نمونے ہیں۔ رومن طرزِ تعمیر یونانی طرزِ تعمیر کا جانشین ہے، لاہور کی اسمبلی کا صدر دروازہ اسی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ رومن طرزِ تعمیر کی جگہ ترکی میں بازنطینی طرزِ تعمیر نے لی۔ استانبول کی مسجد آیا صوفیہ، جامع فاتح، جامع سلیمان اور جامع سلطان احمد اسی طرزِ تعمیر کی مظہر ہیں۔ اس طرزِ تعمیر کی خصوصیت بلند و بالا مینار اور چپٹے گنبد ہیں۔ لاہور میں چوک ریگل کے قریب جو مسجدِ شہدا تعمیر ہو رہی ہے، اس کا گنبد بازنطینی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ بازنطینی طرزِ تعمیر نے اسلامی طرزِ تعمیر میں نئی روح پھونکی، اور یہی اسلامی طرزِ تعمیر ایرانی اور ہندی اختلاط سے مغل طرزِ تعمیر میں بدل گیا۔ آج تاج محل جیسی عجوبۂ روزگار عمارت ہمارے سامنے مغل طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

عام عمارات دو مقاصد کے پیشِ نظر تعمیر کی جاتی ہیں۔ ایک تو عام رہائش یا اجتماعی استعمال کے لیے اور دوسری مذہبی نقطۂ نظر سے، موخر الذکر قسم میں، منادر، مساجد، مقابر اور گرجے آتے ہیں۔ عبادت گاہوں کی تعمیر اور ان کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود حضرتِ انسان کا وجود ہے۔ خانۂ کعبہ دنیا بھر میں قدیم ترین عمارت ہے جس کی بنیاد خود حضرت آدم علیہ السلام نے

رکھی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر ثانی اسی بیت العتیق کی بنیادوں پر کی تھی۔ مقبرہ کی عمارت سب سے پہلے ترکی کے مغربی ساحل لیڈیا کے حاکم موسولس نے اپنی زندگی میں ہی تعمیر کروالی تھی، اُسی کے نام کی مناسبت سے انگریزی زبان میں مقبرہ کو موسولی ام کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں بھی ازمنہ قدیم کی عظیم الشان عمارات کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں عمارات میں شیشہ بھی استعمال ہونے لگا تھا۔ حضرت سلیمانؑ اور فرعون کے دربار تا حال مشہور ہیں اور شدادی عمارت تو بطور محاورہ استعمال ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود اسلام کا اپنا کوئی مخصوص طرز تعمیر نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ غرناطہ کا قصر الحمراء، اشبیلیہ کا دربار ہال، قرطبہ کی جامع مسجد، اصفہان کی مسجد شاہ، لاہور میں علی مردان خان کا مقبرہ، فتح پور سیکری کا بلند دروازہ، سہسرام میں شیر شاہ سوری کا مزار اور آگرہ کا تاج محل مسلمانوں کے تعمیر کردہ ہیں اور آج انہیں اسلامی طرزِ تعمیر کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

عہدِ اسلام میں سب سے اوّل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے فوراً بعد مدینہ کی نواحی بستی قباء میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی جو چند دنوں میں ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ ان گھڑت پتھروں کو گارے کی مدد سے کھڑا کر کے ان پر کھجور کے پتوں کی چھت ڈال دی گئی۔ فی الحقیقت یہی وہ اسلامی طرز تعمیر تھا جس کی بنیاد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ خداوند قدوس و توانا نے کلام پاک میں اسی مسجدِ قباء کے متعلق فرمایا ہے۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلَى التَّقْوٰى مِنَ اللهِ وَرِضْوَانٍ ط

(اس کی بنیاد محض خوشنودی خدا کے لئے تقویٰ و پرہیزگاری پر رکھی گئی)

مسجد قبا کی تعمیر کے چند روز بعد ہی مسجدِ نبوی بھی اسی اصول پہ تعمیر ہوئی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں اس کی کافی حد تک توسیع کروادی تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دمشق میں اپنے لئے ایک عالیشان محل تعمیر کروالیا تھا۔ اس محل کی دیواریں سبز رنگ کی تھیں اس لئے اسے قصر الخضریٰ کہتے تھے۔ یزید کے آخری ایّام حکومت میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف حصین نے مکہ مکرمہ پہ چڑھائی کی۔ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ حرمِ مکہ میں محصور ہوگئے۔ حصین نے مکہ مکرمہ پہ سنگ باری کی جس سے خانہ کعبہ کی عمارت کو کافی نقصان پہنچا۔ محاصرہ ختم ہوا تو ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی مرمت کے لئے یمن سے ابرہہ کے تعمیر کردہ کلیسائ، جسے آباد کرنے کی خاطر وہ کعبہ کو برباد کرنے پہ تل گیا تھا، کے منقوش پتھر اور پچیکاری کے موزئے کعبہ میں لگوائے اور عمارت میں بھی کافی ردّ و بدل کیا۔ عبدالملک کے عہدِ خلافت میں حجاج بن یوسف نے ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ کے تعمیر کردہ حصوں کو مسمار کرکے کعبہ کی عمارت کو قریش کی بنیادوں پہ از سرِ نو تعمیر کروایا۔

عبدالملک نے ہی بیت المقدس میں صخرۂ شریف پہ مثمن وضع کی عمارت تعمیر کی اور اس کے اوپر ایک گنبد بنوایا۔ اسی وقت سے مسلمانوں نے گنبد کو اپنا لیا۔ اس سے پہلے مصر میں فسطاط کے مقام پہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ایک مسجد تعمیر کروائی اور اس کے ساتھ ایک مینار بھی بنوایا۔ اسی دن سے مسجد کے ساتھ مینار تعمیر کرنے کا رواج پڑا۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اپنے عہد خلافت میں مسجد نبوی کی تعمیر نو کا منصوبہ تیار کیا اور اسی سلسلہ میں قیصر روم کو خط لکھا کہ ہم اپنے نبی محترم ؐ کی مسجد نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتے ہیں، تم کاریگر اور سامانِ تعمیر فراہم کرو۔ قیصر نے ایک لاکھ مثقال سونا، چالیس گٹھے سامان مینت کاری اور بے شمار کاریگر اور دیگر ضروری سامان بھیج دیا۔ ایک روائت کے مطابق مدائن سے بھی کچھ سامان منگوایا گیا تھا۔ یہ شہر کسی زمانہ میں ایران کا پایہ تخت رہ چکا تھا، اس لئے ایرانی اثرات بھی رومی اثرات کے ساتھ عرب میں آئے اور یہاں عربوں نے انہیں "مشرف باسلام" کر لیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اوّل بار مسجد میں محراب بنائی، اس کے بعد مسجدوں میں محراب بنانا ضروری ہو گیا۔

ایران میں دامغان کے مقام پر جب مسجد تعمیر ہوئی تو اس کے ساتھ جو مینار تعمیر کئے گئے ان میں کٹہرے (گیلریاں) بھی بنائے گئے۔ عباسی خلیفہ المعتز باللہ (۲۵۲ – ۲۵۵ ہجری) کو عمارات بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے سامرا میں جو محلات بنوائے ان کی دیواروں پر خوبصورتی کے لئے خوشنما رنگوں میں بے جان اشیاء کی تصویریں اور قدرتی مناظر بنوائے اس طرح مسلمانوں نے ایک نئی جدت اپنائی۔ مندرجہ بالا مثالوں سے قارئین کرام کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ آ تک کس قدر غیر ملکی اثرات اسلامی فنِ تعمیر پر اثر انداز ہو چکے تھے۔ جامع مسجد دمشق ایک گرجا کی بنیادوں پر تعمیر ہوئی۔ کرخ میں زبیدہ خاتون کا مقبرہ، بصرہ میں امام حسن بصریؒ کا روضہ اور بغداد میں حضرت شہاب الدین

عمر سہروردیؒ کی درگاہ پر ارمنی طرز کے مندر نُما قبے تعمیر ہوئے۔ مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر قابض ہوتے ہی وہاں کے سب سے بڑے گرجے، سینٹ صوفیہ کو بتوں اور تصویروں سے پاک کر کے اُسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ ترکی کی دیگر مساجد مثلاً جامع فاتح، جامع سلیم، جامع سلیمان، جامع سلطان احمد، جامع بایزید اور جامع ایوبؓ اسی طرز پر تعمیر ہوئیں۔ اس طرح مسلمانوں نے ترکی میں بازنطینی طرزِ تعمیر کو معمولی سے ردّ و بدل سے اپنا لیا۔

جس وقت مسلمانوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی تو اس وقت تک اسلامی طرزِ تعمیر میں وہ تمام عناصر شامل ہو چکے تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ سلطان قطب الدین ایبک نے ہندوؤں کی عالیشان عمارات کو ذہن میں رکھتے ہوئے دہلی میں اسلام کی عظمت کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر بٹھانے کے لئے ایک عظیم الشان مسجد قوت الاسلام کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد کی تعمیر میں ۲۷ مندروں کا پتھر استعمال ہوا تھا، تاحال مسجد کے ستونوں پر ٹوٹی پھوٹی مورتیوں کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ مسلمانوں نے ان منادر کو فتح دہلی کے وقت گرایا ہو گا، ہمارے خیال کے مطابق فتح ہندوستان کے بعد جب غیر مسلموں نے کافی بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا تو انھوں نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مندر اور خود ساختہ معبود توڑ ڈالے۔ سلطان قطب الدین ایبک نے وہی پتھر خانہ خدا میں لگوا دیئے۔ اگر ایک آدھ مثال مسلمانوں کے مندر گرانے کی مل جائے تو کوئی عجب بھی نہیں۔ آج بھی مہذب دنیا میں اپنے مخالفین کی عبادت گاہوں کو

کو نذر آتش کرنے یا مسمار کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔

فتح ہندوستان کے بعد مسلمانوں نے ہندوؤں کے طرز تعمیر خصوصاً ان کے ستونوں کی ساخت اور اونچی کرسی پر عمارت بنانے کے طریقے کو اپنا لیا۔ اس کی واضح مثال اجمیر میں سلطان شمس الدین التمش کی تعمیر کردہ مسجد "ڈھائی دن کا جھونپڑا" ہے۔ اس مسجد کی محرابیں ہندوؤں کے طرز تعمیر سے کافی حد تک متاثر ہیں، نیز اس کے ستون ہندوؤں کے فن تعمیر کا مظہر ہیں۔ ان پر ٹوٹے پھوٹے بتوں کے نشانات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے آج تک اتنی بلند کرسی پر بنی ہوئی مسجد نہیں دیکھی۔ اس مسجد میں داخل ہونے کے لیے بیس پچیس کے قریب سیڑھیاں چڑھنا ہوتی ہیں۔

قطب منار کا شمار ان عمارات میں ہوتا ہے جو مسلمانوں نے فتح دہلی کے فوراً بعد تعمیر کی تھیں۔ ان عمارات کی تعمیر میں مسلمان معماروں سے کہیں زیادہ ہندو معماروں نے حصہ لیا تھا، اس لئے ان عمارات میں ہندوانہ رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اگر قطب منار کی ابتدائی منازل میں کوفی خط میں کتبات کندہ نہ ہوتے تو دیکھنے والے یہی تاثر لیتے کہ یہ منار ہندوؤں کے دور حکومت میں تیار ہوا تھا۔ یہ قطب منار کا ہندوانہ رنگ ہی تھا کہ ہندوؤں نے اُسے "رائے پتھورا کی لاٹھ" مشہور کر دیا۔ قطب منار کے متعلق غالی ہندو اب تک یہی کہہ رہے ہیں کہ پتھوی راج کی ماں جب تک جمنا جی کے درشن نہیں کر لیتی تھی اس وقت تک ناشتہ کو چھوتی تک نہ تھی۔ جب وہ کافی ضعیف ہو گئی اور سفر کے قابل نہ رہی تو پتھوی راج نے یہ لاٹھ بنوا دی تاکہ وہ اس پر چڑھ کر جمنا جی کے درشن کر لیا کرے۔ ہمارے خیال میں قطب منار کے ہندوانہ طرز تعمیر نے

ہندوؤں کو یہ روایت گھڑنے کا موقع دیا ہے۔

شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں چنگیز خان کے حملوں کی وجہ سے ماوراء النہر، ترکستان، خراسان اور خوارزم سے عام لوگوں کے ساتھ ہر فن کے کاریگر بھی کافی بڑی تعداد میں ہندوستان چلے آئے۔ ان کے یہاں آنے سے ہمارے ہاں کے طرزِ تعمیر پر کافی اثر پڑا۔ مہرولی میں علاؤالدین خلجی کا تعمیر کردہ علائی دروازہ گزشتہ تمام عمارات سے بالکل مختلف ہے۔ اس عمارت کو اگر باہر سے دیکھئے تو دو منزلیں نظر آتی ہیں، لیکن اندر جا کر دیکھیں تو ایک ہی منزل نظر آتی ہے۔ اس کا گنبد بھی مختلف طرز کا ہے، ماہرین فن تعمیر نے اسے اس زمانے کا شاہکار قرار دیا ہے۔

خلجیوں کی بساط سلطنت الٹی تو تغلق خاندان حکمران ہوا۔ ان کا طرزِ تعمیر منفرد رنگ لئے ہوئے ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق جن دنوں دیپالپور اور ملتان کا گورنر تھا، اس نے بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب ہی اپنے لئے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کروا لیا تھا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے وہ مقبرہ حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت رکن عالم علیہ الرحمت کے حوالے کر دیا۔ حضرت رکنِ عالم نور اللہ مرقدہٗ اسی مقبرے میں محو خواب ابدی ہیں۔ اس مقبرے کی تین منزلیں ہیں اور جن دیواروں پر گنبد اٹھایا گیا ہے وہ سلامی دار ہیں۔ یہ تمام کی تمام عمارت اینٹوں سے بنائی گئی ہے اور اس میں زیبائش کے لئے کہیں کہیں منقش اینٹیں بھی لگائی ہوئی ہیں۔ دیواروں کو سہارا دینے کے لئے بڑے مضبوط ستون بنائے گئے ہیں۔ اس عمارت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ گنبد کی تعمیر میں اینٹوں کے درمیان لکڑی

کے شہتیر بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ ماہرین فن کا یہ کہنا ہے کہ زلزلہ کی صورت میں یہ شہتیر گنبد کو سنبھال لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ گنبد گذشتہ ساڑھے چھ سو سال میں ہر طرح کے حادثوں سے محفوظ رہا ہے۔ اس عمارت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ صخرہ شریف کی طرح یہ عمارت بھی ہشت پہلو ہے۔ یہ چیز تغلقوں کے فن تعمیر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ دہلی میں بھی انھوں نے جتنی عمارتیں بنوائی ہیں ان کی تعمیر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ عمارت کا بنیادی نقشہ مثمن ہو۔

تغلق خاندان کا خاتمہ امیر تیمور نے کیا اور ہندوستان میں اس کی طرف سے سادات حکمرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ امیر تیمور نے مقبروں کی تعمیر میں ایک نئی جدت نکالی۔ جب اس کی ملکہ بی بی خانم کا انتقال ہوا تو امیر موصوف نے اس کی قبر ایک تہ خانہ میں بنوائی اور اس کے اوپر عالیشان مقبرہ تعمیر کیا۔ امیر تیمور کے عہد سے مغلوں میں اصل قبر تہ خانہ میں بنانے کا رواج پڑا۔ ہمایوں، اکبر، جہانگیر، نورجہاں اور ممتاز محل کے کے مقبروں کی تعمیر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

خاندانِ سادات کے بعد ہندوستان کی حکومت لودھیوں کو ملی۔ سکندر لودھی نے آگرہ کی بنیاد رکھی اور وہاں متعدد عمارات بنوائیں۔ لودھیوں کے گنبد عجیب وضع کے تھے اس زمانے میں مربع عمارت پر بالکل گول گنبد بنانے کا رواج ہوا۔ لاہور میں نولکھا چرچ کی حدود میں حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کے مقبرہ پر جو گنبد تھا اسے دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے بہت بڑی گیند کو درمیان سے کاٹ کر دیواروں پر رکھ دیا ہے۔ اب ہماری غفلت کی وجہ سے یہ عمارت ڈھہ گئی ہے۔ سکندر لودھی کے نااہل جانشین نے

بابر کے مقابلہ میں شکست کھائی اور مغلوں کی ہندوستان پر قبضہ کرنے کی صدیوں پرانی خواہش پوری ہوگئی۔

بابر کو قدرتی مناظر اور باغات سے بڑا اُنس تھا۔ اس لیے اپنے عہد میں باغات تعمیر کروائے۔ مگر موت نے اُسے زیادہ مہلت نہ دی اور وہ ہمایوں کو تاج و تخت سونپ کر راہی ملک بقا ہوا۔ ہمایوں پٹھانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکا اور جان بچا کر ایران کی جانب چلا گیا۔ شیر شاہ حکمران ہوا، لیکن اُسے بھی موت نے مہلت نہ دی۔ اس کا مقبرہ اس کے عہد کی بہترین عمارت ہے شیر شاہ اپنے آبائی وطن سہسرام میں مدفون ہوا۔ مقبرہ ایک وسیع تالاب کے وسط میں کھڑا ہے۔ ایک پُل کے ذریعے وہاں جا سکتے ہیں۔ راقم الحروف سال گذشتہ اس کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے[1]۔ مقبرہ کے اندر لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں مچھر موجود تھے، دُعائے مغفرت پڑھنی بھی دشوار ہو گئی تھی۔ یہ عمارت بھی ہشت پہلو ہے اور حضرت رکن عالمؒ کے مقبرہ کی طرح اس کی بھی تین منزلیں ہیں۔

شیر شاہ کے جانشین نالائق ثابت ہوئے، ہمایوں دوبارہ ۱۵۵۵ء میں بیرم خاں کی ہمت سے ہندوستان پر قابض ہو گیا۔ لیکن چھ ماہ بعد ہی اس نے شیر منڈل کی عمارت سے گر کر وفات پائی۔ اس کی بیوی حاجی بیگم نے اس کے مقبرہ کی تعمیر اپنی نگرانی میں شروع کرائی۔ دس برس میں سولہ لاکھ کی لاگت سے یہ عمارت پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ ہمایوں کے ساتھ ایرانی صناع بھی ہندوستان آ گئے تھے اس لیے اس عمارت میں ایرانی فنِ تعمیر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ مقبرہ ایک وسیع باغ کے وسط میں کھڑا ہے۔ اور یہی باغ اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا ہے۔ مقبرہ کی عمارت

---

[1] یہ ۱۹۵۵ء کا ذکر ہے۔

۲۲ فٹ بلند کرسی پر اٹھائی گئی ہے۔ یہ بغدادی طرز کی ہشت پہلو عمارت ہے (بغدادی طرز میں آٹھوں پہلو برابر نہیں ہوتے۔ چار بڑے اور چار چھوٹے ہوتے ہیں) گنبد کی گردن بے حد چھوٹی ہے۔ گنبد سنگِ مرمر کا ہے لیکن باقی تمام عمارت سنگِ سرخ سے بنی ہے۔ اس میں جابجا رنگدار پتھر آرائش کی خاطر لگا دیے ہیں ایک بات قابلِ غور ہے کہ مقبرے کے ساتھ منارے نہیں بنائے گئے۔ باقی عمارت کو "بانسٹر فلیچر" نے تاج محل کا پیش رو قرار دیا ہے۔ یہ عمارت ۱۵۶۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اسی زمانہ میں ۱۵۶۲ء میں گوالیار میں جناب محمد غوث کا مزار تعمیر ہوا، اس کی جالیاں قابلِ دید ہیں۔ ویسے احمد آباد میں سیدی سید کی مسجد کی جالی دنیا بھر میں بہترین جالی قرار دی گئی ہے۔ تاج محل کے اندر مزارات کے گرداگرد جو جالیاں بنی ہیں ان میں ایسی ہی نفاست برتی گئی ہے۔

اکبر نے فتح پور سیکری میں کافی عمارات بنوائیں۔ اس کی بیوی سلیمہ سلطان بیگم کے محل کی منبت کاری ایک لاثانی نمونہ ہے، لیکن یہ ہے سب سنگِ سرخ پر۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک بلند دروازہ بنایا جو سڑک کی سطح سے ۱۷۶ فٹ بلند ہے اور ہندوستان میں سب سے زیادہ بلند دروازہ ہے۔ اس پر پراچین کاری کے نمونے، قرآنی آیات اور نقش نگار کندہ ہیں۔ شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ خالص سنگِ مرمر سے تعمیر ہوا اس کے ستون اور بریکٹ نفاست اور کاریگری کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ اکبر کے آخری ایامِ حکومت میں سنگِ سرخ کی جگہ سنگِ مرمر نے لے لی تھی۔ اکبر نے اپنے لئے سکندرہ میں مقبرہ تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا اور اس میں ہندو آرٹ کو نمایاں دخل ہے۔ مقبرہ کا بیرونی دروازہ اور اس کے سنگِ مرمر کے

مینار بے نظیر ہیں۔ تاج محل میں ان میناروں کی نفاست اور عمدگی مدِنظر رہی ہو گی۔ تاج محل کے میناروں کے بعد خوبصورتی میں ان ہی کا نمبر ہے۔

اکبر اور جہانگیر کی ہندو بیویاں مخصوص طرز کے محلات میں رہتی تھیں۔ ان کی تعمیر میں ہندو طرزِ تعمیر کو خاص دخل تھا۔ اس طرح ہندو آرٹ زیادہ سے زیادہ مغل آرٹ میں داخل ہونے لگا۔ آگرہ میں جودھا بائی کے محل میں گھومتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی مندر میں گھوم رہے ہیں۔

اسی عہد میں عبدالرحیم خانخاناں کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ یہ مقبرہ ہمایوں کے مقبرہ اور تاج محل کے درمیانی کڑی ہے، ان سب میں اندازاً نصف صدی کا فرق ہے۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقبرہ ہمایوں کا انداز تا حال جاری تھا۔ اس کے بعد ۱۶۲۶ء میں آگرہ میں نور جہاں نے اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ عمارت دریا کے کنارے واقع ہے۔ تاج محل میں بھی یہی چیز مدِنظر رکھی گئی ہے۔ تمام کی تمام عمارت سنگِ مرمر کی ہے پچیکاری کے نمونے بھی بہت عمدہ ہیں۔ چھت پر گنبد کی بجائے بنگالی وضع کی چھت بنائی گئی ہے۔ مگر چاروں کونوں پر مینار موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ نور جہاں نے خود اس عمارت کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اگر آگرہ میں تاج محل نہ ہوتا تو یہی سب سے عمدہ عمارت ہوتی۔ تاج محل کی موجودگی میں اس کا حسن گہنا گیا ہے۔ پرسی براؤن نے اسے اکبر اور شاہ جہان کے طرزِ تعمیر کی درمیانی کڑی قرار دیا ہے۔

لاہور میں انارکلی کا مقبرہ بھی تاج محل کی وضع قطع لئے ہوئے ہے بلکہ اس کا بنیادی نقشہ تاج محل سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاج محل کی طرز پر عمارات بننے لگ گئی تھیں اور مختلف طرز کے نمونے جن کی تاج میں پیروی کی گئی ہے، ملک کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے تھے۔

شاہ جہان نے ان سب کو معمولی ردّ و بدل سے یکجا کر دیا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ عمارت کے کونوں پہ چار مینار تعمیر ہوئے اور قبر کے تعویذ پہ بڑی عمدہ قسم کی پراچین کاری ہوئی۔ یہی فن دیوانِ عام کے شاہی جھروکہ میں اپنے جوبن پہ نظر آتا ہے۔ قلعہ لاہور میں احاطہ شیش محل میں نولکھا بارہ دری پہ بھی اس فن کے باریک اور نفیس نمونے پائے جاتے ہیں۔ دو انچ مربع جگہ میں ۱۰۵ رنگ برنگے پتھر پھول پتیوں کی شکل میں سنگِ مرمر کھود کر بھرے گئے ہیں۔ تاج محل کے اندرونی حصہ میں جالی پہ بہت ہی عمدہ پراچین کاری ہوئی ہے۔

شاہ جہان نے لال قلعہ میں دیوانِ خاص میں بہترین قسم کے نقش و نگار کروائے اور اس پہ خود ہی یہ شعر بھی منقوش کروا دیا۔ ؏

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

اب اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں ہندو اثرات جو اکبر اور جہانگیر کے عہدِ حکومت میں عام ہو گئے تھے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ ایرانی طرزِ تعمیر زیادہ مقبول ہو گیا۔ لاہور میں وزیر خان کی مسجد، گلابی باغ اور دائی انگا کی مسجد اس پہ شاہد ہیں۔

ممتاز الزمانی ملکہ ارجمند بانو نے ۱۶۳۰؁ میں وفات پائی۔ اسی سال تاج محل کی بنیاد رکھی گئی۔ ۲۲ برس میں کروڑوں روپوں کی لاگت سے یہ عمارت تیار ہوئی۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا ہے "کہ تاج محل ایک اشک محبت ہے جو شاہ جہان کی چشم پرنم سے ٹپکا ہے"۔ اس کی تعمیر میں تمام خوبیاں صرف کر دی گئیں اور آج تک کوئی شخص بھی فنی غلطی نہ نکال سکا۔ تاج محل میں بی بی خانم کے مقبرہ

کی پیروی میں تہ خانہ، جہانگیر کے مقبرہ کی طرز پہ کونوں پہ چار مینار، انارکلی کے مقبرہ کی طرح بنیادیں، اکبر کے مقبرہ کے دروازہ کی طرح میناروں میں نفاست، دیوانِ عام دہلی کی طرح پہ پچی کاری، مقبرہ ہمایوں کی طرح بلند کرسی اور بغدادی مثمن، محمد غوث گوالیاریؒ کے مزار کی طرح جالیوں میں عمدگی اور نفاست مقبرہ اعتماد الدولہ کی طرح تمام کی تمام سنگِ مرمر، بلند دروازہ اور مقبرہ اکبر کے دروازہ کی طرح دروازوں پہ آیاتِ قرآنی، مغلیہ عمارات کی طرح باغات و انہار اور عمارات کا تقابل اور بلند و بالا دروازے اور دریا کا کنارہ اور دوسری باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاج محل ۲۲ برس میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا بلکہ وہ مسلمانوں کے گیارہ صدیوں کے فنِ تعمیر کی فنی خصوصیات کا حامل ہے۔

کو نذرِ آتش کرنے یا مسمار کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔

فتح ہندوستان کے بعد مسلمانوں نے ہندوؤں کے طرزِ تعمیر خصوصاً ان کے ستونوں کی ساخت اور اونچی کرسی پر عمارت بنانے کے طریقے کو اپنا لیا۔ اس کی واضح مثال اجمیر میں سلطان شمس الدین التمش کی تعمیر کردہ مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا ہے۔ اس مسجد کی محرابیں ہندوؤں کے طرزِ تعمیر سے کافی حد تک متاثر ہیں، نیز اس کے ستون ہندوؤں کے فنِ تعمیر کا مظہر ہیں، ان پر ٹوٹے پھوٹے بتوں کے نشانات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے آج تک اتنی بلند کرسی پر بنی ہوئی مسجد نہیں دیکھی۔ اس مسجد میں داخل ہونے کے لیے بیس پچیس کے قریب سیڑھیاں چڑھنا ہوتی ہیں۔

قطب مینار کا شمار ان عمارات میں ہوتا ہے جو مسلمانوں نے فتح دہلی کے فوراً بعد تعمیر کی تھیں۔ ان عمارات کی تعمیر میں مسلمان معماروں سے کہیں زیادہ ہندو معماروں نے حصہ لیا تھا۔ اس لیے ان عمارات میں ہندوانہ رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اگر قطب مینار کی ابتدائی منازل میں کوفی خط میں کتبات کندہ نہ ہوتے تو دیکھنے والے یہی تاثر لیتے کہ یہ مینار ہندوؤں کے دورِ حکومت میں تیار ہوا تھا۔ یہ قطب مینار کا ہندوانہ رنگ ہی تھا کہ ہندوؤں نے اسے "رائے پتھورا کی لاٹھ" مشہور کر دیا۔ قطب مینار کے متعلق غالی ہندو اب تک یہی کہہ رہے ہیں کہ پرتھوی راج کی ماں جب تک جمنا جی کے درشن نہیں کر لیتی تھی اس وقت تک ناشتہ کو چھوتی تک نہ تھی۔ جب وہ کافی ضعیف ہو گئی اور سفر کے قابل نہ رہی تو پرتھوی راج نے یہ لاٹھ بنوا دی تاکہ وہ اس پر چڑھ کر جمنا جی کے درشن کر لیا کرے۔ ہمارے خیال میں قطب مینار کے ہندوانہ طرزِ تعمیر نے

ہندوؤں کو یہ روایت گھڑنے کا موقع دیا ہے۔

شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں چنگیز خان کے حملوں کی وجہ سے ماوراء النہر، ترکستان، خراسان اور خوارزم سے عام لوگوں کے ساتھ ہر فن کے کاریگر بھی کافی بڑی تعداد میں ہندوستان چلے آئے۔ ان کے یہاں آنے سے ہمارے ہاں کے طرز تعمیر پر کافی اثر پڑا۔ مہرولی میں علاؤ الدین خلجی کا تعمیر کردہ علائی دروازہ گذشتہ تمام عمارات سے بالکل مختلف ہے۔ اس عمارت کو اگر باہر سے دیکھئے تو دو منزلیں نظر آتی ہیں، لیکن اندر جا کر دیکھیں تو ایک ہی منزل نظر آتی ہے۔ اس کا گنبد بھی مختلف طرز کا ہے ماہرین فن تعمیر نے اسے اس زمانے کا شاہکار قرار دیا ہے۔

خلجیوں کی بساط سلطنت اُلٹی تو تغلق خاندان حکمران ہوا۔ ان کا طرز تعمیر منفرد رنگ لئے ہوئے ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق جن دنوں دیپال پور اور ملتان کا گورنر تھا، اس نے بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب ہی اپنے لئے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کروا لیا تھا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے وہ مقبرہ حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت رکن عالم علیہ الرحمت کے حوالے کر دیا۔ حضرت رکن عالم نور اللہ مرقدہٗ اسی مقبرے میں محو خواب ابدی ہیں۔ اس مقبرے کی تین منزلیں ہیں اور جن دیواروں پہ گنبد اٹھایا گیا ہے وہ سلامی دار ہیں۔ یہ تمام کی تمام عمارت اینٹوں سے بنائی گئی ہے اور اس میں زیبائش کے لئے کہیں کہیں منقش اینٹیں بھی لگائی ہوئی ہیں۔ دیواروں کو سہارا دینے کے لئے بڑے مضبوط ستون بنائے گئے ہیں۔ اس عمارت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ گنبد کی تعمیر میں اینٹوں کے درمیان لکڑی

کے شہتیر بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ ماہرینِ فن کا یہ کہنا ہے کہ زلزلہ کی صورت میں یہ شہتیر گنبد کو سنبھال لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ گنبد گذشتہ ساڑھے چھ سو سال میں ہر طرح کے حادثوں سے محفوظ رہا ہے۔ اس عمارت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ صخرہ شریف کی طرح یہ عمارت بھی ہشت پہلو ہے۔ یہ چیز تغلقوں کے فنِ تعمیر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ دہلی میں بھی اُنھوں نے جتنی عمارتیں بنوائی ہیں ان کی تعمیر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ عمارت کا بنیادی نقشہ مثمن ہو۔

تغلق خاندان کا خاتمہ امیر تیمور نے کیا اور ہندوستان میں اس کی طرف سے سادات حکمرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ امیر تیمور نے مقبروں کی تعمیر میں ایک نئی جدت نکالی۔ جب اس کی ملکہ بی بی خانم کا انتقال ہوا تو امیر موصوف نے اس کی قبر ایک تہ خانہ میں بنوائی اور اس کے اوپر عالیشان مقبرہ تعمیر کیا۔ امیر تیمور کے عہد سے مغلوں میں اصل قبر تہ خانہ میں بنانے کا رواج پڑا۔ ہمایوں، اکبر، جہانگیر، نورجہاں اور ممتاز محل کے مقبروں کی تعمیر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

خاندانِ سادات کے بعد ہندوستان کی حکومت لودھیوں کو ملی۔ سکندر لودھی نے آگرہ کی بنیاد رکھی اور وہاں متعدد عمارات بنوائیں۔ لودھیوں کے گنبد عجیب وضع کے تھے اس زمانے میں مربع عمارت پہ بالکل گول گنبد بنانے کا رواج ہوا۔ لاہور میں نولکھا چرچ کی حدود میں حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کے مقبرہ پر جو گنبد تھا اُسے دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے بہت بڑی گیند کو درمیان سے کاٹ کر دیواروں پر رکھ دیا ہے۔ اب ہماری غفلت کی وجہ سے یہ عمارت ڈھ گئی ہے۔ سکندر لودھی کے نااہل جانشین نے

بابر کے مقابلہ میں شکست کھائی اور مغلوں کی ہندوستان پر قبضہ کرنے کی صدیوں پرانی خواہش پوری ہوگئی۔

بابر کو قدرتی مناظر اور باغات سے بڑا اُنس تھا۔ اس لیے اپنے عہد میں باغات تعمیر کروائے۔ مگر موت نے اُسے زیادہ مہلت نہ دی اور وہ ہمایوں کو تاج و تخت سونپ کر راہی ملک بقا ہوا۔ ہمایوں پٹھانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکا اور جان بچا کر ایران کی جانب چلا گیا۔ شیر شاہ حکمران ہوا، لیکن اسے بھی موت نے مہلت نہ دی۔ اس کا مقبرہ اس کے عہد کی بہترین عمارت ہے شیر شاہ اپنے آبائی وطن سہسرام میں مدفون ہوا۔ مقبرہ ایک وسیع تالاب کے وسط میں کھڑا ہے۔ ایک پل کے ذریعے وہاں جا سکتے ہیں۔ راقم الحروف سال گذشتہ اس کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے[1]۔ مقبرہ کے اندر لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں مچھر موجود تھے، دُعائے مغفرت پڑھنی بھی دشوار ہو گئی تھی۔ یہ عمارت بھی ہشت پہلو ہے اور حضرت رکن عالمؒ کے مقبرہ کی طرح اس کی بھی تین منزلیں ہیں۔

شیر شاہ کے جانشین نالائق ثابت ہوئے، ہمایوں دوبارہ ۱۵۵۵ء میں بیرم خان کی ہمت سے ہندوستان پر قابض ہو گیا۔ لیکن چھ ماہ بعد ہی اس نے شیر منڈل کی عمارت سے گر کر وفات پائی۔ اس کی بیوی حاجی بیگم نے اس کے مقبرہ کی تعمیر اپنی نگرانی میں شروع کرائی۔ دس برس میں سولہ لاکھ کی لاگت سے یہ عمارت پایہ تکمیل تک پہنچی۔ ہمایوں کے ساتھ ایرانی صناع بھی ہندوستان آ گئے تھے اس لیے اس عمارت میں ایرانی فنِ تعمیر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ مقبرہ ایک وسیع باغ کے وسط میں کھڑا ہے۔ اور یہی باغ اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا ہے۔ مقبرہ کی عمارت

---

[1] یہ ۱۹۵۵ء کا ذکر ہے۔

۲۲ فٹ بلند کرسی پر اُٹھائی گئی ہے۔ یہ بغدادی طرز کی ہشت پہلو عمارت ہے (بغدادی طرز میں آٹھوں پہلو برابر نہیں ہوتے۔ چار بڑے اور چار چھوٹے ہوتے ہیں) گنبد کی گردن بے حد چھوٹی ہے۔ گنبد سنگِ مرمر کا ہے لیکن باقی تمام عمارت سنگِ سُرخ سے بنی ہے۔ اس میں جابجا رنگدار پتھر آرائش کی خاطر لگا دئے ہیں ایک بات قابلِ غور ہے کہ مقبرے کے ساتھ منارے نہیں بنائے گئے۔ باقی عمارت کو "بالکل فلیچر" نے تاج محل کا پیش رو قرار دیا ہے۔ یہ عمارت ۱۵۶۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اسی زمانہ میں ۱۵۶۲ء میں گوالیار میں جناب محمد غوث کا مزار تعمیر ہوا، اس کی جالیاں قابلِ دید ہیں۔ ویسے احمد آباد میں سیدی سید کی مسجد کی جالی دنیا بھر میں بہترین جالی قرار دی گئی ہے۔ تاج محل کے اندر مزارات کے گرد اگرد جو جالیاں بنی ہیں ان میں ایسی ہی نفاست برتی گئی ہے۔

اکبر نے فتح پور سیکری میں کافی عمارات بنوائیں۔ اس کی بیوی سلیمہ سلطان بیگم کے محل کی منبت کاری ایک لاثانی نمونہ ہے۔ لیکن یہ سب سنگِ سُرخ پر ہے۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک بلند دروازہ بنایا جو سڑک کی سطح سے ۱۷۶ فٹ بلند ہے اور ہندوستان میں سب سے زیادہ بلند دروازہ ہے۔ اس پر پچین کاری کے نمونہ پر قرآنی آیات اور نقش نگار کندہ ہیں۔ شیخ سلیم چشتیؒ کا مقبرہ خالص سنگِ مرمر سے تعمیر ہوا اس کے ستون اور بریکٹ نفاست اور کاریگری کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ اکبر کے آخری ایام حکومت میں سنگِ سُرخ کی جگہ سنگِ مرمر نے لے لی تھی۔ اکبر نے اپنے لئے سکندرہ میں مقبرہ تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا اور اس میں ہندو آرٹ کو نمایاں دخل ہے۔ مقبرہ کا بیرونی دروازہ اور اس کے سنگِ مرمر کے

مینار بے نظیر ہیں۔ تاج محل میں ان میناروں کی نفاست اور عمدگی مدِ نظر رہی ہو گی۔ تاج محل کے میناروں کے بعد خوبصورتی میں ان ہی کا نمبر ہے۔

اکبر اور جہانگیر کی ہندو بیویاں مخصوص طرز کے محلات میں رہتی تھیں۔ ان کی تعمیر میں ہندو طرزِ تعمیر کو خاص دخل تھا۔ اس طرح ہندو آرٹ زیادہ سے زیادہ مغل آرٹ میں داخل ہونے لگا۔ آگرہ میں جودھا بائی کے محل میں گھومتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی مندر میں گھوم رہے ہیں۔

اسی عہد میں عبدالرحیم خانخاناں کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ یہ مقبرہ ہمایوں کے مقبرہ اور تاج محل کے درمیانی کڑی ہے، ان سب میں اندازاً نصف صدی کا فرق ہے۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقبرہ ہمایوں کا انداز تا حال جاری تھا۔ اس کے بعد ۱۶۲۶ء میں آگرہ میں نور جہاں نے اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ عمارت دریا کے کنارے واقع ہے۔ تاج محل میں بھی یہی چیز مدِ نظر رکھی گئی ہے۔ تمام کی تمام عمارت سنگ مرمر کی ہے پچیکاری کے نمونے بھی بہت عمدہ ہیں۔ چھت پر گنبد کی بجائے بنگالی وضع کی چھت بنائی گئی ہے۔ مگر چاروں کونوں پہ مینار موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ نور جہاں نے خود اس عمارت کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اگر آگرہ میں تاج محل نہ ہوتا تو یہی سب سے عمدہ عمارت ہوتی۔ تاج محل کی موجودگی میں اس کا حسن گہنا گیا ہے۔ پرسی براؤن نے اسے اکبر اور شاہ جہان کے طرزِ تعمیر کی درمیانی کڑی قرار دیا ہے۔

لاہور میں انار کلی کا مقبرہ بھی تاج محل کی وضع قطع لئے ہوئے ہے بلکہ اس کا بنیادی نقشہ تاج محل سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاج محل کی طرز پہ عمارات بننے لگ گئی تھیں اور مختلف طرز کے نمونے جن کی تاج میں پیروی کی گئی ہے، ملک کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے تھے۔

شاہ جہان نے ان سب کو معمولی ردّ و بدل سے یکجا کر دیا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ عمارت کے کونوں پر چار مینار تعمیر ہوئے اور قبر کے تعویذ پر بڑی عمدہ قسم کی پراچین کاری ہوئی۔ یہی فن دیوانِ عام کے شاہی جھروکہ میں اپنے جوبن پر نظر آتا ہے۔ قلعہ لاہور میں احاطہ شیش محل میں نولکھا بارہ دری پر بھی اس فن کے باریک اور نفیس نمونے پائے جاتے ہیں۔ دو انچ مربع جگہ میں ۱۰۵ رنگ برنگے پتھر پھول پتیوں کی شکل میں سنگِ مرمر کھود کر بھرے گئے ہیں۔ تاج محل کے اندرونی حصہ میں جالی پر بہت ہی عمدہ پراچین کاری ہوئی ہے۔

شاہ جہان نے لال قلعہ میں دیوانِ خاص میں بہترین قسم کے نقش و نگار کروائے اور اس پر خود ہی یہ شعر بھی منقوش کروا دیا۔ ع

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است و ہمین است

اب اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں ہندو اثرات جو اکبر اور جہانگیر کے عہدِ حکومت میں عام ہو گئے تھے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ ایرانی طرزِ تعمیر زیادہ مقبول ہو گیا۔ لاہور میں وزیر خان کی مسجد، گلابی باغ اور دائی انگا کی مسجد اس پر شاہد ہیں۔

ممتاز الزمانی ملکہ ارجمند بانو نے ۱۶۳۰ء میں وفات پائی۔ اسی سال تاج محل کی بنیاد رکھی گئی۔ ۲۲ برس میں کروڑوں روپوں کی لاگت سے یہ عمارت تیار ہوئی۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا ہے "کہ تاج محل ایک اشک محبت ہے جو شاہ جہان کی چشم پرنم سے ٹپکا ہے۔" اس کی تعمیر میں تمام خوبیاں صرف کر دی گئیں اور آج تک کوئی شخص بھی فنی غلطی نہ نکال سکا۔ تاج محل میں بی بی خانم کے مقبرہ

کی پیروی میں تہ خانہ، جہانگیر کے مقبرہ کی طرز پہ کونوں پہ چار مینار، انارکلی کے مقبرہ کی طرح بنیادیں، اکبر کے مقبرہ کے دروازہ کی طرح میناروں میں نفاست، دیوانِ عام دہلی کی طرح پیرا چین کاری، مقبرہ ہمایوں کی طرح بلند کرسی اور بغدادی مثمن، محمد غوث گوالیاری ؒ کے مزار کی طرح جالیوں میں عمدگی اور نفاست مقبرہ اعتماد الدولہ کی طرح تمام کی تمام سنگِ مرمر، بلند دروازہ اور مقبرۂ اکبر کے دروازہ کی طرح دروازوں پہ آیاتِ قرآنی، مغلیہ عمارات کی طرح باغات و انہار اور عمارات کا تقابل اور بلند و بالا دروازے اور دریا کا کنارہ اور دوسری باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاج محل ۲۲ برس میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا بلکہ وہ مسلمانوں کے گیارہ صدیوں کے فنِ تعمیر کی فنی خصوصیات کا حامل ہے۔

مسلمانوں کی طبّی خدمات

انسانی معاشرہ میں ہر دور میں طبیب کا وجود بڑا ضروری ہے۔ انسان خواہ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں رہتا ہو یا امریکہ اور سویڈن کے متمدن ترین شہروں میں، ہر جگہ طبیب کی ضرورت شدّت کے ساتھ محسوس کی گئی ہے مسلم سوسائٹی میں طبیب کو جو مقام حاصل ہے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا شرف الدین العطائی نے فوائد فیروز شاہی میں ابواللیث فقیہہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جہاں یہ چھ چیزیں نہ ہوں وہاں رہائش اختیار نہ کرو۔

آبِ رواں، نقدِ رائج۔ قاضیٔ عالم۔ حاکمِ عادل۔ بازارِ آراستہ طبیبِ حاذق۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: علم دو ہیں۔ علم دین اور علم طب، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے علم دین کے ساتھ ساتھ علم طب کی طرف بھی توجہ دی اور اس فن میں وہ وہ کمالات دکھائے کہ اپنے اور بیگانے یہ کہہ اُٹھے کہ اگر آج ارسطو اور جالینوس زندہ ہوتے تو وہ بھی ان کی تصانیف کا احترام کرتے۔

کتب احادیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات ملتے ہیں جن میں حضور نے بعض امراض کے لئے علاج تجویز فرمائے ہیں، مثلاً حضور کا ارشاد ہے کہ بخار کی تپش کو پانی ڈال کر ٹھنڈا کیا کرو۔ آج بھی جب بخار کا درجہ حرارت ایک خاص درجے سے بڑھ جاتا ہے تو ڈاکٹر مریض کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو کر رکھتے اور درجۂ حرارت نیچے لاتے ہیں، شہد کے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اس میں شفا ہے، بعض اہل علم نے اس طرف کافی توجہ دی ہے اور آج طبِ نبوی کے نام سے ایک کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔

حضور سرورِ کائناتؐ کے شوق دلانے پر مسلمانوں میں علم طب کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ طبابت متقی اور دیندار مسلمانوں کا پیشہ بن گیا۔

عہد نبوی میں مدینہ طیبہ میں ام سلیمؓ، ام مطاعؓ، ام عطیہؓ، لیلیٰؓ، رفیدہ انصاریہؓ اور اسماء بنت ابوبکرؓ طبابت کے لئے مشہور تھیں۔

اموی عہد میں ابن آثال، تیاذوق، عیسیٰ بن حکم اور آخری دور میں جابر ابن حیان کا نام ملتا ہے جو اپنے دور میں طبابت اور حذاقت کے لئے مشہور تھے۔ عباسی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی عباسی خلفاء نے علم طب کی طرف کافی توجہ دی اور ان کی قدردانی اور زرپاشیوں سے اس فن کو بڑی ترقی ہوئی۔ المنصور کے عہد میں جورجیس نامی ایک عیسائی طبیب کے کمالِ فن کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ اسی طرح ہارون الرشید کے عہد میں جبریل بن بختیشوع اپنے زمانے کا جالینوس مانا جاتا تھا، ہارون نے اُسے اپنا ندیم و مشیر بنا رکھا تھا اور شاہی دربا

میں اس کی بڑی عزت اور تکریم کی جاتی تھی۔ ہارون نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ اگر کوئی شخص اُسے ملنا چاہے تو وہ پہلے جبریل سے ملے پھر اس کی وساطت سے مجھے ملے۔ جب جبریل کا انتقال ہوا تو مسلمان شعراء نے اس کے مرثیے لکھے۔ اس سے اس کی عوام میں مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مامون الرشید کے عہد خلافت سے پہلے بھی کئی نامور طبیب مثلاً جابر ابن حیان، جورجیس، جبریل بن بختیشوع اور تیاذوق ہو گذرے ہیں۔ لیکن اس چمن میں بہار اس وقت آئی جب ۸۳۳ء میں المامون نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا اور وہاں ابوبکر محمد بن زکریا رازی، یوحنا ابن ماسویہ اور حنین بن اسحٰق جیسے اطباءُ کو طبی تحقیق کے لئے مامور کیا۔

المعتصم کے عہد خلافت میں سلمویہ نامی ایک عیسائی طبیب کے کمالِ فن کا بڑا شہرہ تھا اور خلیفہ نے اُسے اپنا مشیر اور ندیم بنا لیا تھا۔ المعتصم کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ یہ کہا کرتا تھا کہ میرے نزدیک سلمویہ کا مرتبہ قاضی القضاۃ سے کہیں زیادہ ہے۔ خلیفہ کی نظروں میں سلمویہ کا جو مقام تھا اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جب سلمویہ کا انتقال ہوا تو خلیفہ نے اپنے شاہی دربار میں اس کی میت کو لا کر رکھا اور پھر شاہی اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کا جنازہ اُٹھایا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عباسیوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں جن غیر مسلم اطباء نے طبی خدمات انجام دی ہیں ان میں آلِ حنین،

آل بختیشوع اور آل ماسرجویہ خاص طور پر مشہور ہیں ۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک طبی کتابیں عموماً یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں، اس لئے وہ مسلمانوں کی دسترس سے باہر تھیں۔ عیسائی چونکہ یونانی زبان سے بخوبی واقف تھے اس لئے وہ بڑی آسانی کے ساتھ طب یونانی کا مطالعہ کرکے طبابت شروع کر دیتے تھے۔ جب المامون کے ایماء پر بیت الحکمت میں یونانی کتابیں عربی میں ترجمہ ہونے لگیں تو پھر مسلمان اس فن میں غیر مسلموں کو کہیں پیچھے چھوڑ گئے۔ جس دور میں طب پر عیسائی اور صابئی چھائے ہوئے تھے، اس دور میں جبریل بن بختیشوع، حنین، تیاذوق، یوحنا بن ماسویہ، ماسرجویہ، سلمویہ، قسطہ بن لوقا اور ابن البطریق نے بڑا نام پایا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بڑی ضروری ہے کہ قارئین کہیں سطور بالا سے یہ نتیجہ اخذ نہ کریں کہ مسلمانوں نے طب عیسائیوں سے سیکھی ہے یا پھر یونانیوں کی تحریروں سے۔ مسلمانوں نے ان سے یہ فن سیکھا ضرور ہے لیکن ان کی اندھی تقلید نہیں کی۔ مسلمانوں نے اپنے تجربات اور اجتہادات سے طب کے دامن کو مالا مال کر دیا ہے۔ مثلاً ابو المنصور صاعد نے حکمائے یونان کے طریق علاج کے برعکس لقوہ اور فالج کا علاج ادویۂ باردہ سے کیا ہے۔ اسی طرح رضی الدین نے کثرت غذا سے علاج کیا ہے۔ اور ابن الوافد نے بھی علاج بالغذا پر زور دیا ہے۔ مسلمانوں نے جنون کے لئے افیون اور نکسیر کے لئے سرد پانی کا استعمال تجویز کیا ہے۔ اوحد الزمان ابو البرکات نے ایک خاص وبائی مرض میں قطع انامل سے علاج کیا ہے چیچک کے مرض سے بچاؤ کی خاطر مسلمانوں نے ORAL VACCINATION کا طریقہ ایجاد

نفسیاتی علاج بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اس موضوع پر پورا ایک باب نظامی عروضی سمرقندی کے چہار مقالہ میں موجود ہے۔ ابن جلجل اور ابن البیطار نے نئی ادویہ دریافت کیں جن سے اطبائے یونان واقف نہیں تھے۔ اسی طرح مسلمانوں نے اوّل بار ریوند، کافور اور سنا کے خواص معلوم کئے اور جذام اور چیچک کے موضوع پر رسالے لکھے۔ علم کیمیا تو خاص طور پر مسلمانوں کا مرہونِ منت ہے۔ اگر کسی نے مسلمانوں کے اجتہادات کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرنی ہوں تو اُسے التنوخی کی — الفرج بعد الشدۃ — کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ آئندہ صفحات میں ہم چند نامور اطباء کا ذکر کریں گے، جن پر طبِ اسلامی کو فخر ہے۔

جابر ابن حیان، جسے طبی کتابوں میں بابائے کیمیا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، کا شمار ان اطباء میں ہوتا ہے جن پر اُمت مرحومہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ جابر کے ہمعصروں میں کشتوں کی تیاری، تیزاب سازی اور معدنی نمکیات بنانے میں دنیا بھر میں اس کا کوئی مدِمقابل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس نے تصعید، ترشیح، تبخیر اور تقطیر کے فن کو ترقی دی اور شراب سے الکحل کو الگ کر کے اپنے ہمعصر اطباء سے خراجِ عقیدت وصول کیا۔ اسی طرح سنکھیا اور انٹی مونی کو دوسری دھاتوں سے الگ کر کے دنیا بھر کے اطباء سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ نائٹرک ایسڈ، سلفیورک ایسڈ، نائٹرو کلورک ایسڈ، لیکر امونیا، مرکری کلورائڈ، مرکری اوکسائڈ، پوٹاشیم نائٹریٹ، فرانی سلفاس اور الکحل اسی کی ایجاد ہیں۔

۱۱۴۴ء میں ہی جابر کی کتابوں کے یورپی زبانوں میں ترجمے شروع

ہو گئے تھے اور اسی زمانے میں رابرٹ چیسٹر نامی ایک انگریز نے THE BOOK OF THE COMPOSITION OF ALCHEMY کے نام سے کتاب لکھ کر اہلِ انگلستان کو اس کے کارناموں سے روشناس کرایا۔

حنین بن اسحاق (۲۶۴ - ۱۹۴ء) کا شمار ان نامور عیسائی اطباء میں ہوتا ہے جو عہدِ اسلامی میں مسلمان حکمرانوں کی قدردانی اور زرپاشیوں کی بدولت مشہور ہوئے۔ حنین عربی زبان کے علاوہ یونانی اور سریانی زبانوں پر کامل دسترس رکھتا تھا، اس لئے اپنے ہمعصر مسلمان اطباء کی نسبت اُسے یونانی طبّی کتابوں سے استفادہ کرنے کا خوب موقع ملتا تھا۔ طبّی کتابوں کے حصول کی خاطر اس نے روم تک کا سفر بھی کیا تھا۔ اور اس سفر سے واپسی پر المامون نے اُسے دارالحکمت میں ملازم رکھ لیا، جہاں اس کا بیشتر وقت یونانی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کرنے پر صرف ہوتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ ایک کتاب کا ترجمہ کر کے المامون کی خدمت میں پیش کرتا تھا تو وہ اُسے اس کتاب کے وزن کے برابر سونا عطا کرتا تھا۔

ابوبکر محمد بن زکریا رازی (۹۲۵ - ۸۶۵ء) جسے یورپ میں RHAZES کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کا شمار ان اطباء میں ہوتا ہے جن پر ملّتِ اسلامیہ کو بڑا ناز ہے۔ رازی ایک واسطے سے حنین بن اسحٰق کا شاگرد تھا اور اس کے استاد کے متعلق مشہور ہے کہ وہ یونانی، ایرانی اور ہندوستانی طب میں وقوف کامل رکھتا تھا۔ رازی کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی طبیعت جدّت پسند تھی اس لئے وہ نت نئے تجربے کرتا رہتا تھا۔

رازی نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز رے کے ایک ہسپتال میں میں طبیب کی حیثیت سے کیا جہاں وہ تھوڑے ہی عرصہ میں افسرالاطباء بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے بغداد کے ہسپتالوں کا افسرالاطباء مقرر کیا گیا اور یہیں اس کی لیاقت کے اصلی جوہر کھلے۔ ایک کامیاب معالج کی حیثیت سے اس کی شہرت چاردانگ عالم میں پھیل گئی اور دنیا کے گوشے گوشے سے مایوس العلاج مریض اس کے پاس آنے لگے۔

رازی نے علم طب پر چھوٹی بڑی ۱۴۱ کتابیں لکھی ہیں، ان میں وہ ۱۲ رسالے بھی شامل ہیں جو اس نے علم کیمیا پر لکھے ہیں۔ رازی کی سب سے اہم تصنیف الحاوی ہے جس کی بیس سے زیادہ جلدیں دریافت ہو چکی ہیں۔ ۱۲۸۹ء میں اس کتاب کا اوّل بار لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور اس کے بعد یہ کتاب یورپ میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں رازی نے اپنا حاصل مطالعہ اور اپنے تجربات لکھ کر اپنے بعد آنے والے اطباء کے لئے ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے۔

الحاوی کے علاوہ رازی نے جذام اور چیچک پر دو الگ رسالے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک رسالے میں گردے اور مثانے سے پتھری نکالنے کے طریقے بتائے ہیں۔ ان کے علاوہ رازی نے علم تشریح البدن پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ یورپ کے مستشرقین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں میڈیکل سائنس کی ترقی میں الحاوی کو بڑا دخل حاصل ہے۔

علی بن عباس جو یورپ میں HALY ABBAS کے نام سے مشہور ہے، دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں بڑا نامور طبیب

ہو گزرا ہے۔ وہ نسلاً ایرانی اور مذہباً مجوسی تھا، وہ چونکہ اسلامی عہد میں مسلمانوں کی معارف پروری کی وجہ سے مشہور ہوا اس لئے اس کی طبی خدمات کا ذکر بھی مسلمانوں کی طبی خدمات کے ضمن میں ہوتا ہے۔

اس نے علم طب پر ۔ الملکی ۔ کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب لکھی جس پر مدتوں تک اس کے بعد آنے والے اطباء کا دارومدار رہا، لیکن جب بو علی سینا نے ۔ قانون ۔ لکھی تو اس کے مقابلہ میں الملکی کی شہرت ماند پڑ گئی، الملکی کا ۱۵۲۳ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اور اس کے بعد یہ کتاب یورپ میں خوب مقبول ہوئی۔

علی بن عباس نے بڑے بڑے اطباء کے طریق علاج پر جی بھر کر تنقید کی ہے اور اس ضمن میں وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں کوئی طبیب اس وقت تک کامیاب طبیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ باقاعدہ ہسپتال جا کر مریضوں کا معائنہ نہ کرے، چنانچہ اس نے طبیب کیلئے ہسپتال کی حاضری لازمی قرار دی ہے۔

مسلمان اطباء میں ابن الجزار (م ۱۰۰۹ء) کا نام بڑے ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی کتاب زاد المسافر عہد وسطیٰ میں ایشیاء کے علاوہ یورپ میں بھی بڑی مقبول تھی۔ لاطینی زبان کے علاوہ اس کے عبرانی اور یونانی ترجمے بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ زاد المسافر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اندرونی امراض کی تشخیص اور ان کے طریق علاج پر بحث کی گئی ہے۔

شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ بن سینا، جو مغرب میں

AVICENNA کے نام سے مشہور ہے، مسلمان اطباء میں امام کا درجہ رکھتا ہے خالقِ ارض وسماء نے اس کے ہاتھ میں ایسی شفا بخشی تھی کہ لوگ اُسے آیۃٌ مِنْ آیاتِ اللہ۔ کہتے تھے۔

بوعلی سینا سنہ ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اس کا والد بلخ کا رہنے والا اور مذہباً اسمٰعیلی تھا۔ بوعلی نے جونہی ہوش سنبھالا اس کا والد بلخ سے ترکِ سکونت کرکے بخارا چلا گیا۔ اس زمانے میں بخارا کا شمار دنیائے اسلام کے بڑے بڑے علمی مراکز میں ہوتا تھا اور وہاں اس دور کے بہترین اساتذہ درس و تدریس میں مشغول تھے۔ بوعلی کی تعلیم و تربیت اسی مدینۃ العلم میں ہوئی اور اٹھارہ برس کی عمر میں اس کے فضل و کمال کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ سنہ ۹۹۷ء میں امیر بخارا ایک ایسی مرض میں مبتلا ہوا کہ اطباء اس کے علاج سے عاجز آ گئے۔ اس موقع پہ بوعلی نے اس کا کامیاب علاج کرکے شاہی لائبریری سے استفادہ کرنے کی اجازت لے لی۔ سنہ ۱۰۰۴ء میں جب سلطان محمود غزنوی نے بخارا پہ قبضہ کیا تو بوعلی کو غزنی آنے کی دعوت دی۔ بوعلی نے سلطان کی دعوت رد کردی اور خیوہ میں شمس المعالی قابوس کے دربار میں پناہ لی۔ سنہ ۱۰۱۲ء میں قابوس نے وفات پائی تو بوعلی رے چلا گیا۔ بارہ برس بعد اس نے مستقل طور پہ ہمدان میں سکونت اختیار کرلی اور وہیں جون سنہ ۱۰۳۷ء میں درد قولنج سے اس کا انتقال ہوا۔

شیخ الرئیس کے متعلق مشہور ہے کہ سفر و حضر میں شاگردوں کا ایک جمِ غفیر اس کے ساتھ رہتا تھا اور وہ صبح و شام ان کو درس دیتا تھا۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ وہ لکھنے پڑھنے میں بھی کافی وقت صرف کرتا تھا۔ شیخ الرئیس نے طبی لٹریچر میں گراں قدر اضافہ کیا اور اس کی القانون

کے مقابلہ میں میں رازی کی الحاوی اور المجوسی کی الملکی کی شہرت ماند پڑ گئی القانون، جس کی وجہ سے بوعلی سینا کا نام تا قیامت زندہ رہے گا، کے پانچ حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اس نے اصولِ طب کا ذکر کیا ہے، دوسرے حصے میں مفردات سے بحث کی ہے تیسرے حصے میں سر سے پیر تک جسم کے ایک ایک حصے کے امراض کا ذکر کیا ہے۔ چوتھے حصے میں شیخ الرئیس نے امراضِ عامہ سے متعلق بحث کی ہے اور پانچویں حصے میں مرکبات کا ذکر کیا ہے۔

القانون کا بارہویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور اس کے فوراً بعد یہ کتاب یورپ کے طبی نصاب میں داخل ہو گئی۔ سنہ ۱۶۵۰ء تک القانون یورپ کی مشہور ترین یونیورسٹیوں LOUVAIN اور MONTPELLIER کے نصاب میں داخل رہی۔ یورپ میں اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۴۷۰ء سے لے کر سنہ ۱۵۰۰ء تک یہ کتاب سولہ بار طبع ہوئی سولھویں صدی میں اس کے بیس سے زائد ایڈیشن یورپ کے مختلف ممالک میں طبع ہوئے۔ اس کتاب کے متعلق ہمارے اطباءُ کا یہ قول ہے کہ اگر جالینوس اور بقراط زندہ ہو جائیں تو وہ بھی القانون کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

ابوالقاسم الزہراوی، جس پر ملتِ اسلامیہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، قرطبہ کی ایک نواحی بستی مدینۃ الزہرا کا رہنے والا تھا۔ قرطبہ کا شمار اس زمانے میں دنیا کے بہترین علمی مراکز میں ہوتا تھا۔ الزہراوی نے اسی مدینۃ العلم میں اس عہد کے بہترین اساتذہ سے

تعلیم پائی۔

الزاہردی ابھی نوعمر ہی تھا کہ اس کے کمالِ فن کا شہرہ پورے اندلس میں پھیل گیا۔ عبدالرحمٰن الثالث نے پہلے اُسے اپنا ذاتی معالج بنایا۔ بعدازاں اُسے شاہی ہسپتال کا ہاؤس سرجن مقرر کیا، اسی ہسپتال میں اُسے مختلف اقسام کے اپریشن کرنے کا موقع ملا۔ الزہراوی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ۔ **التصریف لمن عجز عن التالیف** ۔ میں مختلف اقسام کے اپریشن کرنے کے طریقے بتانے کے علاوہ ان آلات کی تصویریں بھی دی ہیں جو اپریشن کے دوران استعمال ہوتے ہیں۔ الزہراوی کی اس کتاب کو پڑھ کر اور ان آلات کی تصویریں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں جراحی کا مکمل نظام موجود تھا۔

الزہراوی کا شمار ان نامور اطبا میں ہوتا ہے جنہوں نے امراضِ نسواں (GYNAECOLOGY) پہ کافی کچھ لکھا ہے۔ علم الولادت کا سرجری کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے الزہراوی نے اپنی اس گراں قدر تصنیف میں دائیوں کو خاص ہدایات دی ہیں اس نے ان آلات کی تصویریں بھی دی ہیں جن سے مردہ بچے کو رحم سے باہر نکالا جاتا ہے۔ اسی ضمن میں الزہراوی نے تدابیر حوامل، منع اسقاط، عسر ولادت، تدبیر سیلان طمث حوامل اور اخراج جنین میت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ یورپ میں عہدِ جدید میں سائنس آف مڈوائفری نے جو ترقی کی ہے اس میں الزہراوی کے تجربات اور اس کی تحریروں کو بڑا دخل حاصل ہے۔

امراضِ چشم (OPTHALMOLOGY) پر بھی مسلمانوں نے کافی تحقیق کی ہے اور اس میدان میں وہ دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ عہد اموی میں زینب نامی ایک عورت ماہر امراضِ چشم تسلیم کی جاتی تھی اور دور دور سے لوگ اس سے علاج کرانے آتے تھے۔ تذکرۃ الکحالین میں ابن وصیف، جبریل کحال، شریف کحال اور علی بن عیسیٰ کحال کا ذکر موجود ہے۔ یہ لوگ اپنے دور میں اپنے فن میں اپنا مدِ مقابل نہیں رکھتے تھے۔ اسی ضمن میں علی ابن عیسیٰ بغدادی اور عمار موصلی نام کے دو ماہرین کا ذکر بیجا نہ ہوگا، جنہوں نے امراضِ چشم پر دو کتابیں قلمبند کیں۔ ان لوگوں نے اس فن پر یونانیوں سے کہیں زیادہ کام کیا۔ اور اپنے تجربے، مشاہدے اور حاصل مطالعہ ان کتابوں میں درج کیا۔ ان کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور ۱۷۵۰ء تک ان کی یہ کتابیں یورپ کے طبی نصاب میں شامل رہیں۔ جرجی زیدان نے اپنی مشہور تصنیف ۔۔ تاریخ التمدن الاسلامی۔ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ موتیا بند کا علاج اب بھی وہی ہے جو مسلمان اطباء اس دور میں کیا کرتے تھے۔

ابو علی الحسن ابن الحسن ابن الہیثم (۹۶۵-۱۰۳۹ء) جو امام بصریات کے لقب سے مشہور ہیں، اپنے دور میں اپنے فن میں دنیا بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے اوّل بار اپنی تالیف ۔ کتاب المناظر میں نظریۂ بصارت کی صحیح وضاحت کی۔ وہ پہلے مسلمان ماہر طبیعیات اور طبیب تھے جنہوں نے روشنی اور رنگ، اشعۂ نور کے انعکاس و انعطاف، اغلاط بصری، شفق اور قوس قزح کی حقیقت، ہالہ، مرایا،

قوت ثقل، خلا اور تحرکات کے بارے میں توجیہہ کی۔ ان کی کتاب "المناظر" تو زمانے کے ظالم ہاتھوں سے محفوظ نہیں رہی تاہم اس کا ترجمہ (ON OPTICS) کے نام سے موجود ہے۔ اس کتاب میں ابن الهیثم نے اقلیدس اور بطلیموس کے اس نظریئے کی تردید کی ہے کہ نگاہ آنکھوں سے نکل کر مختلف چیزوں پہ پڑتی ہے اور انھیں دیکھتی ہے۔ ان کی تحقیق یہ تھی کہ خارجی چیزوں کا عکس آنکھ کی پتلی پہ پڑتا ہے جسے دماغ کا ایک عصب محسوس کرتا ہے۔ ابن الهیثم کو THEORY OF VISION کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور انہی کے نظریہ پر تحقیق کر کے دورِ جدید کے سائنسدان کیمرہ، ٹیلی ویژن اور عینک بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ابو المنصور صاعد بن بشر بن عبدوس کا شمار دنیائے اسلام کے نامور ترین اطباء میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے وقت کا بہترین فصّاد تھا اور دُور دور سے لوگ فصد کھلوانے کے لئے اس کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ المنصور کی طبیعت بڑی حد تک جدّت پسند تھی اور وہ مریضوں کا علاج کرتے ہوئے ان پہ نت نئے تجربے کرتا رہتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ عام اطباء کے برعکس لقوہ اور فالج کا علاج ادویۂ باردہ سے کیا کرتا تھا۔

علاؤالدین ابو الحسن علی بن حازم قریشی، جنہیں طبی دنیا میں جالینوس ثانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ عرب اطباء کے سرتاج مانے جاتے ہیں۔ وہ مکہ مکرّمہ میں پیدا ہوئے لیکن ان کی عمرِ عزیز کا بیشتر حصّہ دمشق میں گذرا اور وہیں ۶۸۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے شیخ الرئیس

کی شہرۂ آفاق تالیف — قانون — کا خلاصہ — قانونچہ — کے نام سے تیار کیا۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے مفصول بقراط کی دو شرحیں لکھ کر اپنے وقت کے اطباء سے خراجِ عقیدت وصول کیا۔

مسلمان اطباء میں قاضی عبد اللطیف بغدادی علم التشریح البدن کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں، وہ اپنی تحقیقات کے سلسلے میں بڑے طویل سفر کیا کرتے تھے۔ ایک بار وہ اسی سلسلے میں مصر گئے اور وہاں مقس کے ایک ٹیلے پر اُنھوں نے بیس ہزار کے قریب انسانی ڈھانچے دیکھے۔ اُنھوں نے ان ڈھانچوں کی ساخت کا بڑے غور سے مطالعہ کیا اور اس کی تفصیل اپنے سفر نامہ میں درج کی، اسی طرح اُنھوں نے بوصیر کے قبرستان میں خاص قسم کی انسانی ہڈیوں کا مشاہدہ کیا ان کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے ایسی ہڈیاں ان کی نظر سے نہیں گزری تھیں۔ قاضی موصوف یہ کہا کرتے تھے کہ اگر جالینوس نے بھی میری طرح انسانی ڈھانچوں پر تحقیق کی ہوتی تو پھر وہ اتنی غلطیاں نہ کرتا۔

منصور بن محمد نام کے ایک مسلمان طبیب کا ذکر بھی اکثر کتابوں میں دیکھنے میں آیا ہے، وہ بھی علم التشریح البدن کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے ۱۳۹۶ء میں اپنا حاصل مطالعہ — کتاب التشریح — کے نام سے قلمبند کیا اور اس کتاب میں اُنھوں نے جا بجا مختلف اقسام کی ہڈیوں کی تصویریں بھی دی ہیں۔ اس کتاب کا ایک مصور نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

جس طرح موجودہ زمانے میں بعض امراض کے SPECIALISTS

موجود ہیں اسی طرح مسلمانوں کے ہاں بھی قرونِ وسطیٰ میں SPECIALISTS موجود تھے۔ ابن عکاشہ اپنے دور میں امراض مثانہ کا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا اور ہارون بن موسیٰ الاشبونی سرجری کے فن میں اپنی نظیر آپ تھا۔ صاعد بن بشر بن عبدوس فصد کھولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور دوا سازی میں ابن البذوخ، احمد بن یونس، التمیمی، عمر بن یونس، غافقی، ابن جلجل، رشید الدین اور ابن البیطار بڑے مشہور ہوئے ہیں اسی طرح بعض اطبا کے ناموں کے ساتھ فصّاد، اسنانی اور کحال کی نسبتیں پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مخصوص فن میں بڑا نام پایا ہے۔

مسلمان اطباء کے زمرہ میں اگر ابو علی التنوخی (۹۴۳ - ۹۹۴ء) اور اس کی مشہور تالیف الفرج بعد الشدۃ کا ذکر نہ کیا جائے تو ان کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اس کتاب کے چودہ ابواب ہیں اور ان میں بڑے مزے کی حکائتیں درج ہیں۔ التنوخی نے ان حکائتوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے اطباء بھی عام علاج کی بجائے محض ٹوٹکوں سے کامیاب علاج کرتے ہیں، یا اگر کبھی اطبا کسی مریض کے علاج سے عاجز ہو گئے ہیں تو اتفاقیہ مریض کے ہاتھ کوئی ایسی چیز لگ گئی جسے کھانے سے وہ صحت یاب ہو گیا۔ راقم الحروف نے تاریخ کے شہرہ آفاق استاد پروفیسر شیخ عبد الرشید صاحب کو ایک نجی محفل میں فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بعض امراض کے علاج یونہی اتفاقیہ دریافت ہوئے ہیں۔

التنوخی لکھتا ہے کہ رازی کے پاس ایک مریض آیا جو استسقا کے

مرض میں مبتلا تھا۔ رازی نے اس کا معائنہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا مرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ اب لاعلاج ہو گیا ہے۔ رازی نے اس مریض کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ گھر جا کر آرام کرو اور جو چاہو کھاؤ پیو۔ تقریباً سال بھر کے بعد رازی کا اس طرف سے گذر ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ شخص نہ صرف یہ کہ تندرست ہو چکا ہے بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ تنومند ہے۔ رازی نے بڑی حیرت سے اس سے حال دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنی زندگی سے تنگ آ چکا تھا اور اسی سوچ میں تھا کہ کسی طرح اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے۔ ایک دن ایک سانپ ادھر آ نکلا اور اس نے چھاچھ کو دودھ سمجھ کر ایک پیالہ میں منہ ڈالا۔ جب سانپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے وہ چھاچھ پیالہ میں اگل دی جس سے چھاچھ کا رنگ بدل گیا۔ جب وہ سانپ وہاں سے چلا گیا تو اس شخص نے خودکشی کی نیت سے وہ چھاچھ پی لی۔ چھاچھ کا پینا تھا کہ اُسے نیند آ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ پسینہ سے شرابور تھا اور اس کی بیماری جاتی رہی تھی۔

الفرج بعد الشدۃ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی علاج کارگر نہ ہوتا تھا تو بعض اطبا سکتے کے مریض کو کوڑے مارتے تھے۔ اسی طرح فالج کے مریض کو دودھ میں حنظل اُبال کر پلاتے تھے اور ذات الجنب کے مریض کے لئے بچھو کا ڈنک تجویز کرتے تھے، اس کتاب میں اس طرح کی درجنوں حکایات ہیں جن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات ٹوٹکوں سے بھی کامیاب علاج ہو جاتا تھا۔

مسلمانوں نے امراضِ نسواں پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ ابوالقاسم

الزہراوی نے اس سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ شیخ الرئیس ابن سینا، یوحنا ابن ماسویہ، ابوبکر محمد بن زکریا رازی اور عبداللطیف بغدادی نے بھی اس موضوع پر کافی کچھ لکھا ہے۔ عہد نبوی میں اسماء بنت ابوبکرؓ، ام سلیمؓ، ام مطاعؓ، ام عطیہؓ، لیلیٰؓ اور رفیدہ انصاریہؓ عورتوں کے علاج کے لئے خاص طور پر مشہور تھیں۔ اموی عہد میں زینب نامی ایک عورت امراض چشم کے علاج کے لئے مشہور تھی۔ خلیفہ منصور کے عہد میں حفید کی بہن اور بھانجی شاہی حرم میں بیگمات کا علاج کیا کرتی تھیں۔ ان میں ام الحسن بنت قاضی ابوجعفر اندلسی کی حذاقت کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ عہد شاہجہان میں ملک الشعراء طالب آملی کی بہن ستی النساء عورتوں کے علاج کیلئے خاص طور پر مشہور تھی اور شاہی حرم میں اسی کا علاج ہوتا تھا۔

مسلمان اطباء نے جہاں نسوانی امراض کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہے وہاں عورتوں کے لئے گلگونے اور غازے بھی تیار کئے ہیں۔ ان کے استعمال کے لئے عطریات اور خضاب بنائے ہیں پھنسے مہاسے اور چھائیاں دور کرنے کے لئے دوائیاں ایجاد کی ہیں۔ اسی طرح رنگ گورا کرنے کے لئے اُبٹن اور بال بڑھانے کے تیل تیار کئے ہیں۔

عباسی عہد میں اسکندریہ، رُہا اور جندی شاپور میں میڈیکل کالج موجود تھے جہاں طلباء کو باقاعدہ علمِ طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ نظامی عروضی کی ایک تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کالجوں میں سات سال کا نصاب تھا۔ فاضل مصنف چہار مقالہ میں لکھتے ہیں کہ میرے زمانے

میں میڈیکل کالجوں میں فصولِ بقراط، مسائل حنین بن اسحٰق، شرح نیلی، الحاوی، قانون، ذخیرۂ ثابت بن قرہ، منصوری، اغراض الطب، ذخیرہ خوارزم شاہی اور کامل الصناعۃ پڑھائی جاتی ہیں ۔

ان طالب علموں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ انسانی لاشوں کو چیر پھاڑ کر دیکھیں تاکہ وہ جان سکیں کہ قدرت نے انسانی ڈھانچہ کس طرح سے بنایا ہے اور انسان کے اندرونی اعضاء کی ساخت کیا ہے شیخ الرئیس ابن سینا کا قول ہے کہ جب تک کوئی طبیب انسانی لاشوں کو چیر پھاڑ کر نہ دیکھے اس وقت تک وہ کامیاب طبیب نہیں بن سکتا ۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب طلباء اپنا کورس ختم کر لیتے تھے تو پھر ماہر طبیب ان کا امتحان لیتے تھے اور امتحان میں کامیاب ہونے والے طلباء کو باقاعدہ سند دی جاتی تھی ایک دوسری روایت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ المقتدر کے عہد میں کسی نیم حکیم نے ایک مریض کو غلط علاج سے مار ڈالا تو خلیفہ نے یہ حکم صادر کیا کہ سنان بن ثابت بغداد کے تمام اطباء کا انٹرویو لے اور جو طبیب اس کے معیار پر پورا نہ اترے اُسے طبابت سے روک دے۔ مصر میں یہی کام مہذب الدین نے انجام دیا۔ ہمارے خیال میں یہ اطبا کی رجسٹریشن کی طرف پہلا قدم تھا ۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں دنیائے اسلام میں ہسپتالوں کا ایک جال بچھا دیا۔ عبدالملک بن مروان نے دماغی امراض کے علاج

کے لئے دار المجانین کے نام سے ایک ہسپتال قائم کیا۔ ہارون الرشید نے بغداد میں ایک عالیشان ہسپتال بنوایا۔ البرامکہ نے اپنے خرچ سے عوام کے فائدے کے لئے ایک ہسپتال قائم کیا۔ المتوکل کے وزیر فتح بن خاقان نے بیمارستان مغافر کے نام سے ایک ہسپتال بنوایا المقتدر کے عہد میں اس کے وزیر علی بن عیسٰی نے بیمارستان حربیہ کے نام سے ایک ہسپتال قائم کیا۔ ان کے علاوہ بغداد میں بیمارستان عضدی، بیمارستان السیدہ، بیمارستان ابن الفرات اور بیمارستان مقتدری کے نام سے چار اور ہسپتال موجود تھے۔ عین ممکن ہے کہ آج کل بغداد میں اتنے ہسپتال نہ ہوں جتنے آج سے ہزار سال پہلے موجود تھے۔

مقریزی نے قاہرہ کے پانچ ہسپتالوں کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ان میں سے اولین ہسپتال احمد بن طولون نے ۸۷۳ء میں قائم کیا تھا اور اس کی تعمیر پر ساٹھ ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ قاہرہ کا دوسرا اہم ہسپتال بیمارستان الکبیر تھا جو ملک المنصور نے ۱۲۸۵ء میں قائم کیا تھا۔ اس ہسپتال کا سالانہ خرچ دس لاکھ درہم کے لگ بھگ تھا۔ اس ہسپتال کی جو تفصیل مقریزی نے دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ہسپتال میں مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ وارڈ تھے۔ زنانہ وارڈوں میں نرسیں اور مردانہ وارڈوں میں خدام مریضوں کی خدمت پر مامور تھے۔ اس کے علاوہ مختلف امراض کے مریضوں کے لئے الگ الگ وارڈ تھے۔ ایک وارڈ میں صرف پیچش کے مریض رکھے جاتے تھے اور دوسرا وارڈ صرف بخار میں مبتلا مریضوں کیلئے

مخصوص تھا۔ اسی طرح ایک وارڈ میں وہ مریض رکھے جاتے جن کے اپریشن کئے جاتے تھے اور ایک وارڈ آنکھوں کے علاج کے لئے وقف تھا۔ ہسپتال میں مریضوں کے لئے پرہیزی غذائیں تیار کرنے کے لئے باورچی خانے موجود تھے۔ ڈسپنسری اور اس کے ساتھ ادویہ کے لئے سٹور موجود تھے جہاں ہر وقت دوائیوں کا بڑا سٹاک موجود رہتا تھا۔ ہسپتال کے سٹاف کے لئے رہائشی کوارٹرز بھی بنے ہوئے تھے مقریزی کے اس بیان کو پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ بیمارستان الکبیر کسی طرح بھی ہمارے عہد کے کسی ہسپتال سے پیچھے نہیں تھا۔

برِ صغیر پاک و ہند میں محمد بن تغلق نے ہسپتال بنانے میں بڑی دلچسپی لی۔ ایک روائت کے مطابق اس کے عہد میں صرف دہلی میں ہی ستر کے قریب ہسپتال اور ڈسپنسریاں موجود تھیں۔ سلطان بذاتِ خود بڑا اچھا طبیب تھا اور وہ مریضوں کا معائنہ کر کے ان کے لئے نسخے تجویز کر دیتا تھا۔ اس کے جانشین فیروز تغلق نے اپنی تصنیف فتوحاتِ فیروز شاہی میں شفا خانے تعمیر کرنے کا ذکر کیا ہے۔ جہانگیر نے بھی تخت نشین ہوتے ہی اپنی قلمرو میں شفا خانے تعمیر کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں بعض علاقوں میں شہروں سے دور دیہات میں رہنے والوں کی سہولت کے لئے سفری شفاخانے موجود تھے۔ عباسی خلیفہ المقتدر کے عہد خلافت میں سنان بن ثابت ایسے شفاخانوں کا انچارج تھا۔ اکثر کتابوں میں ایسے حوالے عام ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے علاج کے لئے جیلوں میں بھی شفاخانے

موجود تھے۔

سطورِ بالا کی روشنی میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں پوری دنیائے اسلام میں ہسپتالوں کا ایک جال بچھا دیا اور اپنے تجربات اور اجتہادات سے فنِ طب کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ یہ مسلمان ہی تھے جن کی وجہ سے جالینوس اور بقراط کو شہرت دوام ملی یہاں یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ طبِ اسلامی، طبِ یونانی کا ہی دوسرا نام ہے۔ آج جسے طبِ اسلامی کہتے ہیں وہ طبِ یونانی، طبِ ایرانی، طبِ ہندوستانی اور طبِ مصری کا حسین امتزاج ہے۔ یہاں بھی یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ مسلمانوں نے دوسری اقوام کے تجربات سے فائدہ ضرور اٹھایا ہے۔ لیکن ان کی کورانہ تقلید نہیں کی، بلکہ اپنے اجتہادات اور تجربات سے طبِ اسلامی کے نام سے ایک الگ عمارت کھڑی کر دی ہے۔

موجودہ ایلوپیتھی کی ترقی میں مسلمانوں کی تصانیف اور ان کے لاطینی تراجم کو جو دخل حاصل ہے اس کا ذکر بھی گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ آج جدید میڈیکل سائنس کی کتابیں طبِ اسلامی کی اصطلاحات سے مملو ہیں۔ آج بھی یورپ کے میڈیکل کالجوں میں لیکچروں کے دوران اساتذہ بار بار AVICENNA، ALHAZEN، GABER، RHAZES، HALY ABBAS اور AVERROES کا حوالہ دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ہم نے مسلمانوں کی طبی خدمات کا ایک بہت ہی مختصر سا جائزہ لیا ہے، اگر ان کی خدمات کا مفصل ذکر کرنا ہو تو۔

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لیے

ایک تاریخی غلطی کا ازالہ

داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد

تعمیر ملت کے اہم فریضہ کو جس انہماک، خلوص اور اہتمام سے صوفیائے کرام نے انجام دیا ہے اس کی مثال دوسرے مذاہب کی تاریخ میں مفقود ہے۔ یہ صوفیائے کرام ہی کی مساعی جمیلہ کا ثمرہ ہے کہ آج برّصغیر پاک و ہند میں اسلام کے سولہ سترہ کروڑ نام لیوا موجود ہیں اور آج ان دونوں ملکوں کی لاکھوں مساجد سے روز و شب میں پانچ بار صدائے توحید بلند ہوتی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اگر آپ ان بزرگوں کے کارناموں، ان کی تعلیمی اور تبلیغی کوششوں اور سوانح حیات سے واقفیت پیدا کرنا چاہیں تو آپ کو صحیح اور مستند حالات نہ مل سکیں گے۔ ان کے متعلق جس قدر لٹریچر ملتا ہے اس پر کشف و کرامات اور عقیدت کی کہر چھائی ہوئی ہے اور جس قدر روایات ملتی ہیں ان سے ہم ان بزرگوں کی سیرت نگاری تو درکنار ان کی دھندلی سی تصویر بھی نہیں بنا سکتے۔ صوفیوں کے تذکروں کے متعلق عموماً اور خزینۃ الاصفیاء کے متعلق خصوصاً مشہور تاریخ دان پروفیسر محمد حبیب فرماتے ہیں، " اس کتاب کا بڑا نقص یہ تھا کہ مصنف نے عقاید کا سہارا لیکر ان تمام اصول اسناد کو یکسر نظر انداز کر دیا مقاصد علمائے اسلام

کی نظر میں صدیوں تک علم و حکمت کی روح سمجھے جاتے رہے ہیں، تنقیدی اصولوں سے چشم پوشی کر کے محض عقاید پر علم کی عمارت تعمیر کرنا ناسمجھی نہیں تو کیا ہے۔[1]

تاریخ مشائخ چشت کے دیباچہ میں موصوف لکھتے ہیں، اس قسم کی تحریریں متضاد افکار کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہیں اور بالآخر ان کا نتیجہ بدعقیدگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ صاحب **خزینۃ الاصفیاؒ** نے اپنی کتاب میں ہیبت ناک قسم کی ایسی کرامات کی تفصیل دی ہے جن کو پڑھ کر انسانی عقل و خرد کو شرم آجاتی ہے موجودہ نسلیں ان پر بحث و مباحثہ کرنے کی بجائے بے توجہی سے ان کو نظر انداز کرنا بہتر سمجھتی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کشف و کرامات کے بے معنی قصوں کا تصوف سے دور کا بھی تعلق نہیں شیخ نظام الدین اولیاؒ کا کہنا ہے کہ کرامات تصوف کے سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔[2]

ہمارے سوانح نگاروں مثلاً علامہ فریدالدین عطارؒ، مفتی محمد سرور لاہوری، امیر حسن سجزیؒ، نور احمد چشتیؒ، شیخ الہدیہ اور صاحبزادہ کمال الدین محمد احسان نے محیر العقل روایات لکھ کر فن سوانح نگاری اور اصول تذکرہ نویسی سے انحراف کیا ہے۔ ان کی بدولت غلط روایات خاص و عام میں مشہور ہو گئیں، ان میں سے ایک حضرت داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق ہے۔

---

[1] خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۳ء ص ۲۰-۲۱

[2] ایضاً۔

خواجہ حسن سجزیؒ فوائد الفواد میں داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق لکھتے ہیں:۔

شیخ حسین زنجانی و شیخ علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہما ہر دو مرید یک پیر بودہ اند و آن پیر قطبِ عہد بودہ است، شیخ حسین زنجانی از دیر باز ساکن لہاور بود، بعد از چند گاہ پیر ایشان خواجہ ہجویری را فرمودہ کہ در لہاور رو و ساکن شو، شیخ علی ہجویری عرض داشت کرد کہ حسین زنجانی آنجا ہست، پیر فرمودہ کہ تو برو، و چون علی ہجویری بحکم اشارت ایشاں در لہاور در آمد شب بود بامداداں جنازۂ شیخ حسین زنجانی را بیرون آوردند[۳۵]

شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہما دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے اور وہ پیر اپنے وقت کے قطب تھے۔ شیخ حسین زنجانی مدت سے لاہور میں قیام پذیر تھے۔ کچھ مدت بعد ان کے پیر نے خواجہ ہجویری سے فرمایا کہ لاہور جاؤ اور وہیں رہو۔ شیخ علی ہجویری نے عرض کی کہ حسین زنجانی جو وہاں ہیں۔ پیر نے فرمایا کہ تم جاؤ۔ جب علی ہجویری ان کے حکم کے مطابق لاہور پہنچے تو اس وقت رات ہو چکی تھی۔ اگلی صبح لوگ شیخ حسین زنجانی کا جنازہ اٹھائے باہر نکلے۔

یہ روائت کثرت سے تذکروں میں پائی جاتی ہے کہ اب ہر شخص بلا چون و چرا اسے تسلیم کر چکا ہے اور اس کا منکر بد عقیدہ اور بد مذہب ہونے کی تہمت سے نہیں بچ سکتا۔ ہمارے خیال میں یہ روایت سراسر غلط اور الحاقی معلوم ہوتی ہے۔ اس روائت کا تجزیہ کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم اس روائت کے الفاظ پر غور کریں گے اس کے بعد اسے تاریخ کی کسوٹی پر رکھیں گے۔

---

[۳۵] خواجہ حسن سجزی، فوائد الفواد، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۵۷

اس روائت میں حضرت داتا گنج بخش کو ایک جگہ شیخ علی ہجویری، دوسری جگہ خواجہ ہجویری اور تیسری جگہ علی ہجویری لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت حسین زنجانیؒ کو ایک جگہ شیخ حسین زنجانیؒ دوسری جگہ حسین زنجانیؒ اور تیسری جگہ پھر شیخ حسین زنجانی لکھا ہوا ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ خواجہ حسن سجزی جیسا ذمہ دار تذکرہ نویس اور فاضل اجل ایسی شتر گربگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ فوائد الفواد تو ایسی بلند پایہ اور مستند کتاب ہے کہ امیر خسروؒ اسے دیکھ کر اکثر فرمایا کرتے تھے۔

کاشکے تمام تصنیفات من بنام حسن لبودی　　کاش میری تمام تصانیف حسن کے نام ہوتیں
وایں کتاب از من بودی[۲۵]　　اور یہ کتاب میرے نام ہوتی۔

ہمارے خیال میں یہ روائت الحاقی ہونے کے ساتھ ساتھ کسی کم عقل کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ خواجہ حسن سجزی کو سید علی ہجویری کی بجائے گنج بخشؒ لکھنا چاہیے تھا، یہ خطاب سید علی ہجویری کو خواجہ موصوف کے پیر چہارم خواجہ معین الدین اجمیریؒ عطا فرما چکے تھے، اس لئے انھیں سنت شیخ کا ادب کرنا چاہیئے تھا۔

فوائد الفواد کے متعلق علم تاریخ کے ممتاز عالم اور راقم الحروف کے استاد مرحوم پروفیسر محمد شجاع الدین ماہنامہ "دار العرفان"، بابت ماہ جنوری ۱۹۵۵ء میں اپنے ایک مضمون بعنوان "حسن سجزی" میں تحریر فرماتے ہیں " کہ ان ملفوظات میں بہت سی الحاقی باتیں بھی شامل ہو چکی ہیں"۔ ہمارے بیشتر اکابر کی تصانیف میں تحریف ہو چکی ہے۔ بسا اوقات ایک ہی کتاب کے دو نسخے آپس میں نہیں ملتے۔ اسی طرح کئی فرضی کتابیں مثلاً شجاع حیدری، دیوان خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ، دیوان خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور دیوان زیب النساء وجود میں آچکی ہیں۔ شیخ عبدالحق

---

[۲۵] شیخ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ، دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۱۰۱

محدّث دہلویؒ کے زمانے تک شیخ بو علی قلندر پانی پتیؒ کی مثنویات اور رسائل عام ہو چکے تھے، شیخ محدثؒ نے انہیں مخترعاتِ عوام بتایا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ تزکِ جہانگیری کے مختلف نسخوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے جب یار لوگوں نے حدیثیں گھڑ کر صحاح ستہ میں شامل کر دی ہیں تو پھر صوفیوں کے تذکروں کا کہنا۔ حقائق بالا کی روشنی میں فوائد الفواد کی روایات پر کیونکر اعتماد کیا جائے۔ ہمارے خیال میں جن کتابوں میں فوائد الفواد کے حوالے سے یہ روائت بیان کی گئی ہے وہ بھی پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہیں۔

اس روائت میں شیخ حسین زنجانیؒ اور سید علی ہجویریؒ کو ایک ہی پیر کا مرید ظاہر کیا گیا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ہم عصر تھے۔ جہاں تک تاریخی شواہد کا تعلق ہے شیخ حسین زنجانیؒ اور سید علی ہجویری ہم عصر نہیں بلکہ شیخ حسین زنجانیؒ اور خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ ہم عصر ہیں۔ سیر العارفین میں شیخ جمالی کنبوہؒ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حضرت شیخ المشائخ حسین زنجانی کہ پیر حضرت شیخ سعد الدین حمویہ قدس سرہٗ است در صدر حیات بود میان حضرت زبدۃ المشائخ والاولیاٗ معین الحق والدین قدس سرہٗ و حضرت شیخ المشائخ والاولیاٗ شیخ حسین زنجانی قدس سرہٗ محبتے و اتحادی فوق الحد واقع شد[۱۶]

حضرت شیخ المشائخ حسین زنجانی جو حضرت شیخ سعد الدین قدس سرہٗ کے پیر ہیں، ان دنوں حیات تھے۔ حضرت زبدۃ المشائخ والاولیاٗ معین الحق والدین قدس سرہٗ اور حضرت شیخ المشائخ والاولیاٗ شیخ حسین زنجانی قدس سرہٗ کے درمیان بے حد محبت اور رابطہ و ضبط تھا۔

---

[۱۶] شیخ جمالی، سیر العارفین، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر ۵ II PF، ورق ۳ب۔

عمل صالح کا مصنف محمد صالح کنبوہ بھی خواجہ صاحبؒ کے حالات کے ضمن میں رقمطراز ہے:-

بالجملہ در لاہور بہ صحبتِ شیخ حسین زنجانیؒ رسیدہ۔[۵۷]	مختصر یہ کہ انہیں لاہور میں شیخ حسین زنجانی کی صحبت میسر آئی۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں اس بات کا ذکر با لصراحت کیا ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کی لاہور میں شیخ حسین زنجانیؒ سے ملاقات رہی۔[۵۸]

ان روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور حضرت حسینؒ زنجانی ہم عصر تھے اور دونوں میں بڑی محبت تھی۔

خواجہ معین الدینؒ کے ایک ہم عصر مؤرخ منہاج سراج جوزجانی اپنی مشہور تصنیف طبقاتِ ناصری میں خواجہ صاحب کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ایں داعی از ثقہ شنید کہ از معارف جبال بلاد تولک بود لقب او معین الدین او می گفت کہ من در آں لشکر با سلطان غازی بودم۔[۵۹]	اس دعا گو نے قابل اعتبار لوگوں سے یہ سنا ہے کہ بلاد جبال کا ایک درویش، جس کا لقب معین الدین تھا، یہ کہا کرتا تھا کہ میں سلطان (شہاب الدین غوری) کے لشکر میں غازی کی حیثیت سے شامل تھا۔

خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے جس جنگ میں شرکت فرمائی تھی وہ ترائن

---

[۵۷] محمد صالح، عمل صالح، جلد اوّل، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۵۰

[۵۸] دارا شکوہ، سفینۃ اولیاء، (اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۸

[۵۹] جوزجانی، طبقات ناصری، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۴ء، ص ۳۵

کی دوسری جنگ تھی جو سنہ ۱۱۹۲ء میں لڑی گئی تھی۔ حضرت داتا گنج بخش نے سنہ ۱۰۷۲ء میں یا اس کے فوراً بعد وفات پائی ہے[10]، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن ایّام میں خواجہ صاحب لاہور میں حسین زنجانیؒ کے ساتھ مقیم تھے اس وقت حضرت داتا گنج بخشؒ کو فوت ہوئے تقریباً ایک صدی گذر چکی تھی۔ اس لئے حضرت داتا گنج بخش اور حسین زنجانیؒ ہم عصر نہیں ہو سکتے۔

تحقیقات چشتی کی روایت کے مطابق حضرت شیخ حسین زنجانیؒ سنہ ۶۰۴ھ میں فوت ہوئے تھے۔[11] مفتی غلام سرور کی تحقیق کے مطابق سنہ ۶۰۰ھ ان کا سالِ وفات ہے[12]۔ مولوی نور احمد چشتی اور مفتی غلام سرور لاہوری، دونوں نے حضرت داتا گنج بخش کا سالِ وفات سنہ ۴۶۵ھ تحریر کیا ہے۔ ان کے اس بیان کے مطابق جب حضرت حسین زنجانیؒ فوت ہوئے اس وقت داتا گنج بخشؒ کو انتقال کئے ۱۳۹ یا ۱۳۵ سال گذر چکے تھے۔ اب آپ یہ اندازہ لگائیے کہ صاحبِ فوائد الفواد کی یہ روائت کہ جب داتا گنج بخشؒ لاہور پہنچے تو اس وقت رات تھی۔ اگلی صبح حضرت حسین زنجانیؒ کا جنازہ اُٹھا، کہاں تک صحیح ہے؟۔

---

[10] شیخ محمد اکرام نے آب کوثر مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۶۶ء، ص ۷۷، پر داتا صاحبؒ کا سالِ وفات ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء بتایا ہے، جو غلط ہے۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب نے داتا گنج بخش کے حالات میں جو فاضلانہ کتاب تحریر فرمائی ہے اس میں وہ اس سن پر متفق نہیں ہیں۔ اور اورینٹل کالج میگزین میں آغا یحییٰ جیبی نے بھی داتا صاحب کے سن وفات پر فاضلانہ بحث کی ہے وہ بھی سنہ ۴۶۵ھ پر متفق نہیں ہیں۔

[11] نوار احمد چشتی، تحقیقات چشتی، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۵

[12] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۲۸۴ھ، ص ۹۰۵

صاحب فوائد الفواد کی تحریر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سید علی ہجویریؒ کے پیر حضرت ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ نے انہیں اپنی حیات ہی میں حضرت حسین زنجانیؒ کی جگہ لینے کے لئے لاہور بھیج دیا تھا، حالانکہ کشف المحجوب میں حضرت علی ہجویریؒ کی یہ تحریر موجود ہے۔

آن روز کہ وی را وفات آمد بہ بیت الجن بود و آں دہی ست بہ سر عقبہ میان بانیا رود دمشق، سر بہ کنار من داشت[13]

جس دن ان کا انتقال ہوا وہ بیت الجن میں تھے۔ یہ ایک گاؤں ہے جو عقبہ جانے والی سڑک پر دمشق کے قریب بانیا ندی کے کنارے واقع ہے۔ (وفات کے وقت) ان کا سر میرے زانو پر تھا۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں حضرت ابو الفضل محمد بن حسن ختلیؒ کا سالِ وفات ۴۵۳ھ تحریر کیا ہے[14] پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب علامہ ذہبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۴۶۰ھ میں انتقال فرمایا تھا۔[15] نور احمد چشتی کی روایت کے مطابق حضرت حسین زنجانیؒ ۵۵۷ھ میں لاہور تشریف لائے تھے،[16]

---

[13] سید علی ہجویریؒ، کشف المحجوب، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء، ص ۱۷۳

[14] غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیاء، ص ۸۸۵

[15] پروفیسر عبدالرشید، دی لائف اینڈ ٹیچنگز آف حضرت داتا گنج بخشؒ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۲۵

[16] تحقیقات چشتی، ص ۲۱۳

یعنی حضرت ختلیؒ کی وفات کے ۱۰۴ یا ۹۷ سال بعد، اور ان کا انتقال بقول چشتی سنہ ۶۰۴ھ میں یعنی حضرت ختلیؒ کی وفات کے ۱۵۱ یا ۱۴۴ سال بعد ہوا تھا۔ اب کہیے کہ داتا گنج بخش متوفی سنہ ۴۶۹ھ حضرت حسین زنجانیؒ کی وفات پر لاہور میں کیونکر وارد ہوئے تھے۔

مولوی نور احمد چشتی نے بھی داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق وہی واقعہ نقل کیا ہے جو خواجہ حسن سجزی نے فوائد الفواد میں بیان کیا ہے۔ مولوی صاحب کو اتنی بھی ہوش نہیں رہتی کہ وہ اپنی کتاب میں داتا صاحبؒ کی وفات سنہ ۴۶۵ھ اور حضرت حسین زنجانیؒ کی سنہ ۶۰۴ھ لکھ کر پھر بھی داتا صاحبؒ کو حضرت زنجانیؒ کے جنازہ میں شریک کر دیتے ہیں[۱۷]

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کا قصہ من وعن وہی تحریر کیا ہے جو صاحبِ فوائد الفواد نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے داتا صاحبؒ کا سال وفات سنہ ۴۶۵ھ لکھا ہے اور حضرت حسین زنجانیؒ کا سنہ ۶۰۰ھ، اس کے باوجود انھوں نے حضرت داتا گنج بخشؒ کو حضرت حسین زنجانیؒ کے جنازہ میں شریک کر کے داخل ثواب کر دیا ہے۔

جب تحقیقات چشتی اور خزینۃ الاصفیا میں اس طرح کی بے وسر و پا باتیں درج ہوں تو پھر ان پر کس طرح اعتماد کیا جائے ہمارے خیال میں داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق جو روائت فوائد الفواد میں درج ہے وہ صحیح نہیں۔ ہمیں تو وہ روائت الحاقی

---

[۱۷] ایضاً، ص ۱۸۹۔

معلوم ہوتی ہے فوائد الفواد ہی کے ایک اندراج سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے کشف المحجوب کا بغور مطالعہ فرمایا تھا[شاہ] جہاں داتا گنج بخشؒ نے اپنی اس تالیف میں یہ درج فرمایا ہے کہ جب حضرت ختلیؒ کا بیت الجن میں انتقال ہوا تو ان کا سر میرے زانو پر تھا، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی نظر سے یہ تحریر ضرور گزری ہوگی۔ اس لئے حضرت سلطان المشائخ ایسی بے تحقیق بات نہیں کہہ سکتے تھے کہ حضرت ختلیؒ نے انہیں حضرت زنجانی کی جگہ لینے کے لئے لاہور بھیجا۔ وہ رات کے وقت لاہور پہنچے اور اگلی صبح حضرت زنجانیؒ کا جنازہ اُٹھا۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ بات واضح ہے کہ حضرت ختلیؒ نے ۴۵۳ھ یا ۴۶۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت ہجویریؒ لاہور تشریف لائے اور اُنھوں نے ۴۶۹ھ یا اس کے فوراً بعد انتقال فرمایا۔ حضرت ہجویریؒ کے انتقال کے ۱۱۲ برس بعد حضرت زنجانیؒ لاہور تشریف لائے اور اُنھوں نے یہاں ۴۳ یا ۴۷ سال قیام کے بعد ۶۰۰ھ یا ۶۰۴ھ میں وفات پائی۔

* * *

[شاہ] امیر حسن سجزی، فوائد الفواد۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۸۷

[illegible] الٰہی اور اس کا پس منظر

محمد اسلم

استاد شعبۂ تاریخ ، پنجاب یونیورسٹی

دین الٰہی کی اصل حقیقت اور اس کا پس منظر معلوم ہو جانے کے بعد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃاللہ علیہ کی تحریک اور ان کے کام کی اہمیت دہ چند ہو جاتی ہے - اس بنا پر کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم اور حد درجہ وقیع دستاویز ہے اور تاریخ کے اساتذہ اور طلبا کے لئے تحقیق کا ایک معیار پیش کرتی ہے -

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

مدیر ''برھان،، دہلی

قیمت سات روپے پچاس پیسے

*

ندوۃالمصنفین ، ۹۵۰ این سمن آباد ، لاہور

۲ ۔ آئینۂ ادب ، چوک مینار انارکلی ، لاہور

الٰہی اور اس کا پس منظر

محمد اسلم

استاذ شعبۂ تاریخ ، پنجاب یونیورسٹی

دین الٰہی کی اصل حقیقت اور اس کا پس منظر معلوم ہو جانے کے بعد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃاللہ علیہ کی تحریک اور ان کے کام کی اہمیت دہ چند ہو جاتی ہے - اس بنا پر کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم اور حد درجہ وقیع دستاویز ہے اور تاریخ کے اساتذہ اور طلبا کے لئے تحقیق کا ایک معیار پیش کرتی ہے -

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

مدیر ''برہان،، دہلی

قیمت سات روپے پچاس پیسے

*

ندوۃ المصنفین ، ۹۵۰ این سمن آباد ، لاہور

۲ ۔ آئینہ ادب ، چوک مینار انارکلی ، لاہور